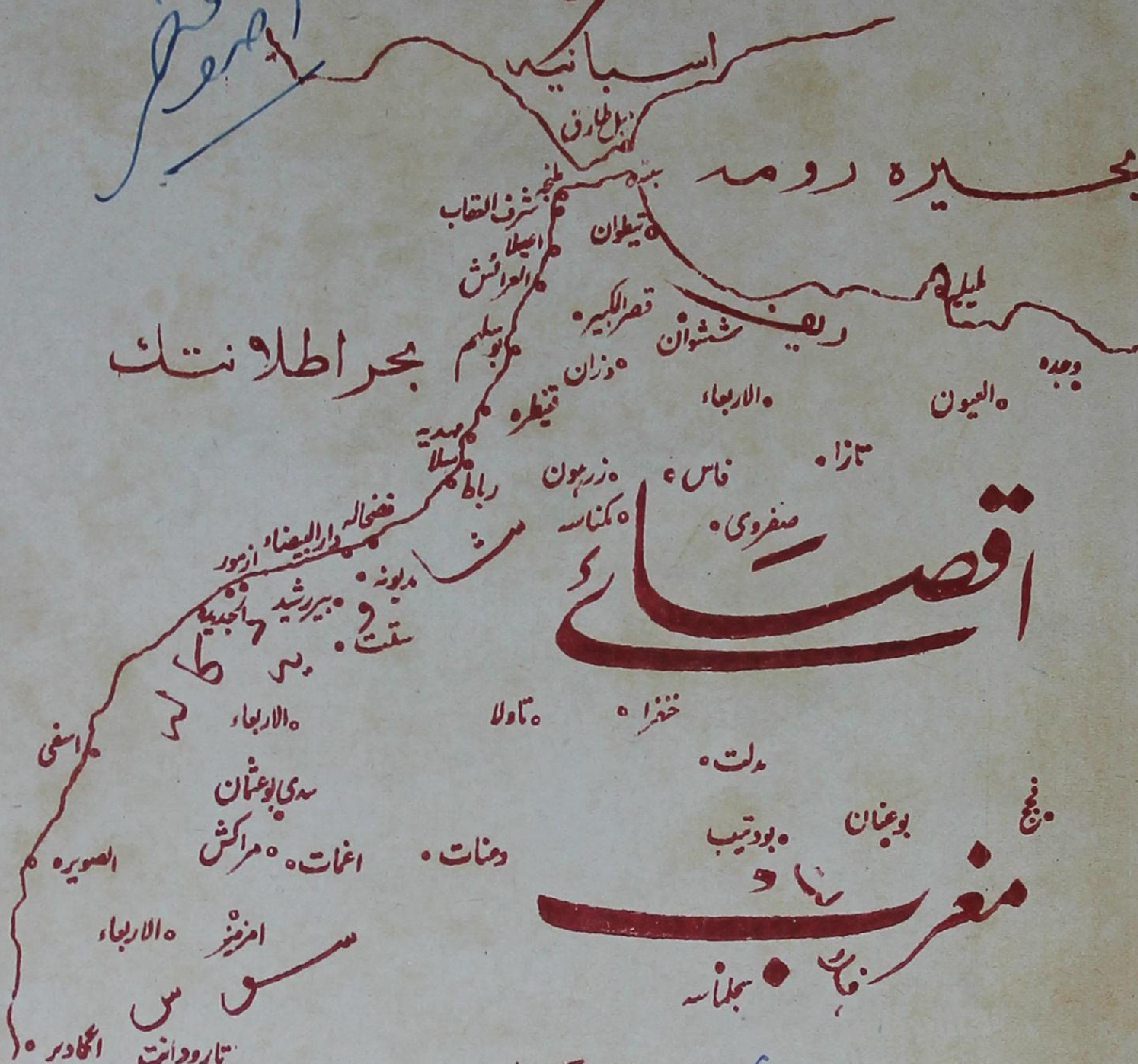
With compliment from the Author

1st Moharram
1355 A.H.

سفرنامہ



مغرب اقصیٰ

مرتبہ

میر دبیر الحاج قاضی ولی محمد صاحب

بھوپال سول سروس

جاروب کش حرمین شریفین زادہم اللہ شرفاً وتعظیماً

بواب آستانہ مولائی وآقائی سیدی عقبہ رحمۃ اللہ علیہ

رفیق مجالس تاریخ مجریط وپاریس

رکن دائرۂ علمیہ حیفا، دمشق، بیروت، رباط، قیروان

رکن مجالس ایشائے وسطیٰ لندن، پاریس

Panegyric

سفرنامہ

مغرب اقصیٰ

(مراکو)

مرتبہ

میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب

مدینہ برقی پریس بجنور میں باہتمام محمد مجید حسن پرنٹر طبع ہوئی

باراول تعداد ایکہزار

تہدیہ

پس از عمری بہ کوشش ہیروی۔ می خواہم ای قاصد

کہ بر روئش نگاہِ اولیں۔ از چشم من باشد

اس صحبت دیرینہ کی یاد میں جو ۱۹۰۳ء میں معسکر بنگلور اور معاون کولار

میں حاصل ہوئی اور جس کے لطف سے باوجود امتداد زمانہ اس وقت

تک قلب لبریز ہے یہ یادداشت صحرا نوردی کریم الخلق عظیم الشان

عمیم الاشفاق مکرمی و محترمی

غلام احمد صاحب کلامی

کے نام نامی پر بلا اجازت و بلا اطلاع

معنون

کی جاتی ہے

شرط اسلام بود۔ ورزش ایمان بالغیب

اے تو غائب ز نظر مہر تو۔ ایمان من است

عرضِ حال

ساقی قدحے کہ دورِ پندار گذشت	مطرب غزلے کہ وقت گفتار گذشت
اے ہم نفس از بہر دل زار بگو	افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت

۱۹۲۲ء میں مجھے تاریخ اندلس کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ساحل راوی پر مولانا خلیل سراوی مدظلہ نے گلزار قرطبہ کی چمن بندی شروع کی تھی جس کی شمیم جاں پرور نے کوہستان بندھیاچل کے اس نیم مردہ کو اس قدر وارفتہ کر دیا کہ وہ ۱۹۲۴ء میں بہارستان اندلس نہیں نہیں۔ کربلائے اندلس کی خاک اڑانے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اور یہ اسی کا خمار تھا جس نے ۱۹۳۰-۳۱ء میں مغرب اقصیٰ۔ الجزائر۔ افریقیہ۔ وصقلیہ کا پاتراب بندھوا دیا۔

بہ ہستی سر دگر ہستم ساز دمر اساقی	ہنوز از بادہ پارینہ ام پیمانہ بود ارد

۱۹۲۴ء کی سیاحت اندلس کے سلسلہ میں سرسری طور پر موطن بطوطہ اور اس کی ملحقات کے سوا اور کسی طرف جانے کا اتفاق نہ ہو سکا ۲۵ء و ۲۶ء کے طولانی قیام یورپ میں بھی اہم سرکاری مشاغل نے افریقہ جانے کی اجازت نہ دی۔ لیکن ۳۰ء میں بعد واپسی انگلستان مرزبوم اتھیلو کے پرکما کرنے کی مہورت نکل ہی آئی اور آخر کار جب ماہ دسمبر میں قدیم فراموش کردہ عربی بندرگاہ مارسی لے پر بسم اللہ مجریہا ومرسہا کہکر رستم یونان کی تقلید میں جنت الفردوس اسپرائیڈیز سے تفاح ذہب پر چنگل مارنے کا موقعہ مل گیا تو سواحل اندلس کو باچشم تر دیکھتا ہوا طنجہ کی بین الاقوامی سرزمین پر قدم رکھکر مغرب اقصیٰ کا دروازہ اس خیال سے کھٹکھٹایا کہ

اسی ملک کی بیشتر سپاہ نے اندلس کو تسخیر کیا تھا۔ پھر اسی کی عربی و بربری خانہ جنگی نے اندلس کو تباہ کیا اور بالآخر اسی کی دشت ریگ نے مظلوم و مقہور جلا وطنان اندلس کو پناہ دی تھی۔ میرے خیال میں بلا سیاحت مغرب اقصیٰ تاریخ اندلس کی تکمیل دقت طلب ہے۔ مورخ اندلس کے لئے صرف کوہ نوردی شارا نوید اہی کافی نہیں ہے بلکہ صحرائے حمرا کی دشت نوردی اور اجادل مراکش و فاس کی خوشہ چینی کرکے جبل اطلس کو کاندھوں پر اٹھانا پڑیگا تب کہیں اس بارگراں سے سبکدوش ہوسکیگا اندلس کے آثار اسلامیہ سے اگر کسی کو دلچسپی ہے تو مراکش و رباط الفتح کے منارے فاس و مکناسہ کے قصور کو چشم عزت سے دیکھنا غیر مفید نہ ہوگا۔ غرناطی تہذیب و معاشرت کا نقشہ ذہن نشین کرنے کے لئے تیطوان و سلا کی کوچہ گردی ضروری ہے۔ فقہائے قرطبہ و اشبیلیہ کی علمی مجالس کا عکس اتارنے کے لئے علما قیروتیین کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا ہر طرح سے سبق آموز ہے۔ نوحہ خوان الحمرا کے لئے دار جامعہ پر اشک فشاں ہونا لازمی ہے۔ رصافہ کی شمیم جانفزا سے وہی دماغ معطر ہوسکیگا جس نے مراکش کے جنتہ میمونیہ۔ فاس کے باغ جلو و اور رباط کے بستان بتارہ کی تختہ بندی دیکھی ہو۔ لیکن چشم عبرت اور دل مجروح کا ہونا بھی لازمی ہے ؎

دررہ منزل لیلیٰ کہ خطرہا ست بسے	شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

یہ اوراق پریشاں کہ جن کی خامیوں سے راقم الحروف ناواقف نہیں اس خیال سے شائع کئے جارہے ہیں کہ اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہو یہ داستان کہ جس کی ترتیب ان خطوط سے کی گئی ہے جو فقیر نے اپنے اعزا و احباب کو دوران سیاحت میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے اس قابل نہیں ہے کہ زبان دانی کی محک پر کسی

جائے۔ یہ مغربی ملغوبہ کی ایک انجلی ہے جس کو ایک عدیم الفرصت ۔کثیر المشاغل پریشان حال صحرانورد نے کتابی شکل میں بھر کر برادران ملت کے سامنے پیش کیا ہے صوف کی ایک برنس ہے جو خیاط کی مقراض اور زردوز کی کشیدہ کاری سے محروم ہے لیکن قلب مطمئن ہے کہ اس دلق بوقلموں میں ہر پیوند مناسب جگہ پر چسپاں ہے اور ہر تاریخی وجغرافی تذکرہ صحیح اور خالی از مبالغہ ہے۔ پھر بھی اندیشہ ہے کہ اس بے نمک ضیافت سے نازک طبائع منغص نہ ہو جائیں لیکن اگر اس کے دوش بدوش فدائی اندلس مولانا خلیل الرحمٰن مدظلہ العالی اور ان کے قابل رشک فرزندان کی قابل قدر تصانیف وتراجم زیر نظر رکھ لی جائیں گی تو وقت بیکار نہ جائیگا۔

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نہ زاہد بدست آور رگ جانی ونشتر را تماشہ کن

اس سفر میں مجھے علی بھائی طیب جی اور لقمان ابراہیم جی بہت آئے کہ جنھوں نے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا اور جن کی گرم صحبت افریقہ سے قلب وزبان سرگرم تشکرو امتنان ہے۔ اگر ان اوراق کو قبل از طباعت وہ دیکھ لیتے تو ان کے تاثرات بھی درج کر لیتا لیکن وہ مدیغاسکر میں آرام پذیر ہیں اور میں بعد المشرقین ہندوستان میں۔

زاں یار کوچ کردہ کہ گوید پیام من وانجا بجز صبا کہ رساند سلام من

قصبہ کسمندی کلاں ضلع لکھنؤ
۱۹۳۲ء

حقیر دبیر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Tangier

طنجہ

اگرچہ آج سے چھ سال قبل شہر طنجہ کا سرسری چکر لگا چکا تھا۔ لیکن وہ بسلسلہ سیاحت اندلس ایک ضمنی جھلک تھی کہ شرف العقاب کے طواف اور احباب مرشان کی دعوت کے بعد فوراً اندلس واپس جانا پڑا۔ لیکن اس مرتبہ تو مستقر طارق۔ موطن ابن بطوطہ۔ ملجا ر ادریس۔ بازیگاہ عقبہ۔ ماویٰ معتمد۔ رزمگاہ اسمٰعیل مقتل انگلستان سے ہی سرزمین مغرب کی دشت نوردی کی بسم اللہ کرنے کا عزم ہے۔ اور خوش ہوں کہ جو شہر ایک ملکۂ انگلستان کے جہیز میں کبھی آیا تھا۔ اسی کے پُرامن و دلفریب سوق الکبیر میں مقیم ہوں۔ گو ساتھ ہی ساتھ حیران ہوں کہ اس کلید بحیرہ رومہ کو انگلستان کی بیدار و دور اندیش قوم نے اپنے ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ مانا کہ عربوں سے سخت سامنا کرنا پڑا تھا جو تقریباً ہر معرکہ میں غالب رہے حتیٰ کہ ایک بار انگریزی سپاہ کو عربی خنجر کے گھاٹ اترنا پڑا اور باوجود کثیر المقدار رشوت کے عبداللہ غیلان بن علی نے انگریزی لشکر کی "کہ جس میں انگلستان کے مشہور ادیب و مضمون نگار اڈیسن کا باپ پادری کی خدمت پر مامور تھا" ایسی درگت کی کہ طنجہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن

اگر کوشش جاری رکھی گئی ہوتی تو ساحل افریقہ پر جبل الطارق کے مقابل یہ دوسرا مورچہ بھی انگلستان کے قبضہ میں ہوتا۔ کیونکہ اس وقت یہ شہر نہ تو انگریزوں کے قبضہ میں ہے اور نہ سلطان مغرب اقصیٰ کے پاس ہے۔

شہر طنجہ جسے "باب مغرب" کہنا ناموزوں نہ ہوگا بحیرہ رومہ اور بحر اطلانتک کے سنگم پر ایک چھوٹے سے ٹیلہ پر قائم ہے۔ اس کے اور اندلس کے درمیان بحر زقاق کی تپلی دھار واقع ہے کہ جس کا عرض کسی جگہ دس اور کسی جگہ پندرہ بیس میل ہے۔ مرشان کے مرتفع میدان پر کھڑے ہو کر اندلس کے ساحلی شہر مثل جزیرۃ الخضرا۔ طریفہ۔ قادس وغیرہ دن کو صاف دیکھ سکتے ہو۔ اور اگر طاقت ور دوربین موجود ہو تو وہاں کے باشندے بھی چلتے پھرتے نظر آسکتے ہیں۔

ہندوستان سے آنے والوں کے لئے آسان ترین راستہ طنجہ کا یہ ہے کہ بمبئی سے جبل الطارق تک ڈاک کے جہاز پر آؤ اور وہاں سے طنجہ کے لئے کسی مقامی جہاز کو لے لو۔ لندن سے طنجہ تک براہ ریل و جہاز ۲ ½ دن اور براہ سمندر ۳ ½ دن کا راستہ ہے۔

اس عارضی دورِ حیات میں آب و دانہ نے مختلف بین الاقوامی دیار کی سیر کرائی۔ گلزار قسطنطینہ کی نکہت جانفزا سے ابھی تک دماغ معطر ہے۔ گو اس وقت جبکہ راقم الحروف کو اسکی آستان بوسی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ترکی جاہ و جلال کا چراغ گل ہونے کو تھا اور اُس کی عظمت و وقار کے پاسبان دوسرے ملک کو سدھار چکے تھے۔ اور باب عالی کا مشہور پھاٹک اپنی زبان خستہ حالی سے ماتم کر رہا تھا کہ ع جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے۔ لیکن خیر پھر بھی اسلامی حکومت کا نام باقی تھا۔ ساحل خضرا کے عربی آثار سے ابھی تک دل داغدار ہے۔ قاہرہ کی سکتہ الحدید کے شور و غل سے کان گونج رہے ہیں۔ دمشق کی

جبل صالحیہ اور تونس کے شارع مرسا کے جلسہ آنکھوں میں پھر رہے ہیں لیکن جبل طارق ہو یا بیروت۔ غلطہ کا پل ہو یا شارع خلیل۔ بتعدد بین الاقوامی شہروں کا مشاہدہ کر چکنے کے بعد وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ طنجہ کی پچاس ہزار آبادی میں جو دل کشی و دلفریبی ہے وہ قابل دید ہے۔ اسپین کے جہلا۔ فرانس کے عیش پرست۔ اطالیہ کے مغنی۔ یونان کے دست دراز۔ جرمنی کے فیلسوف۔ جاپان کے اولوالعزم۔ چین کے صناع۔ انگلستان کے مدبر۔ ایران کے مدہوش۔ ٹرکی کے پست ہمت۔ عرب کے فقرا۔ سندھ کے قسمت آزما۔ امریکہ کے دولتمند۔ ہالینڈ کے گھوسی۔ بخارا کے درویش۔ مصر کے ناعاقبت اندیش۔ حبش کے مزدور افریطش کے بطّال۔ شمال افریقہ کے مظلوم۔ جبل اطلس کے غیور۔ اگر ایک جگہ دیکھنا منظور ہوں تو سوق الصغیر کے قہوہ خانہ مراکشی میں ایک دو گھنٹہ صرف کرو۔ اور ملک ملک کے باشندہ کو اس کی اصلی حالت میں مشاہدہ کر لو۔ دیکھو وہ پست قامت مگر بلند ہمت۔ شمسی چہرہ چھوٹی آنکھوں والا جوان جو ذخائر بازار کو بھانپتا جاتا ہے "سرزمین مطلع خورشید" کا فرزند سعید معلوم ہوتا ہے۔ سامنے کی دوکان پر جو تاجر ایک سادہ لوح عرب کے ہاتھ ملمع کا سامان سہ چند و چہار چند قیمت پر فروخت کر رہا ہے۔ وہ یقیناً ناپولی کا سنور گلگانی ہے۔ تراہہ کے قہوہ خانہ میں جو ماہوش سرگرم ناوک فگنی ہے وہ بلاشبہ مون مارت کی حسن فروش میدموزیل ہے۔ ابھی ابھی ادھر سے جو ایک دراز قامت نازک اندام نوجوان کلاہ گاندھی بر سر فردائی پشمینہ در بر ایک مزدور کو ساتھ لئے جا رہا ہے وہ حیدرآباد سندھ کے اولوالعزم تاجر جیٹھمل کا نمائندہ سنت رام ہے۔ وہ شش سالہ پیر فرتوت چوسر میں منہمک رہ کر مزاج طفلانہ کا مصداق بنا ہوا ہے۔ بدبخت ترک کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ شاندار قوی الجثہ سہی قامت غیور حبشی کو نشہ حکومت چپ و راست دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس بیدار

وجواں بخت قوم کا نام لیوا ہے۔ جس کی وسیع سلطنت پر آفتاب عالم تاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اُدھر دیکھو ایک جوان طربوش پوش بادہ صہبا چھلکا رہا ہے۔ اسے جانتے ہو؟ یہ ملک فراعنہ کا نمایندہ بظاہر مسلمان مگر بباطن لا مذہب۔ زبان سے حضرت امام شافعیؒ کا مقلد لیکن دل سے اپی کورس کا پرستار ہے۔ پاس ہی ایک فربہ اندام یورپی کسی خیال میں مستغرق چلا جا رہا ہے جس کی نظر نہ کسی دوکان کی طرف اٹھتی ہے نہ قہوہ خانہ کی نای و نوش اس کو متوجہ کرتی ہے۔ یہ جرمنی کا حکیم ہے جو راہ چلتے بھی کسی نہ کسی مسئلہ کی موشگافی میں منہمک ہے۔ وہ میم جو بھیک منگوں کی استدعا پر بار بار بٹوہ کھولنا چاہتی ہے اور وہ مرد جو جیب میں ہاتھ لے جا کر خالی نکال لاتا ہے۔ امریکہ کے کروڑپتی فیلسوف شیراز کی حکمت کی زندہ تفسیر ہیں کہ تونگری بہ دل است نہ بہ مال۔ وہ عبا پوش جو نعرہ الفقر فخری کے ساتھ ساتھ دست طلب دراز کرنے میں مطلق نہیں شرماتا۔ سرزمین عرب کا پیشہ ور فقیر ہے وہ خورد سال لڑکے جو قہوہ خانہ میں ہر نو وارد کے سامنے اپنی کسوت لے کر جوتہ صاف کرنے کے لئے رکوع میں ہو جاتے ہیں ان کو تم نے پہچانا۔ یہ کون ہیں؟ آہ فاتحان یورپ۔ غازیان اسلام کے چشم و چراغ۔ بدنام کنندہ طارق۔ ننگ غمارہ۔ جانشین اسمٰعیل فرزندان عبدالکریم شبریف کے سوا اور کس کی قسمت میں یہ کفش برداری لکھی تھی۔ ع

قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

طنجہ بہت آسانی سے بحیرہ روم کا فوجی ناکہ ہو سکتا ہے۔ لیکن برطانیہ کے سامنے جو ۲ صدی سے جبل الطارق پر مورچہ بند ہے اس شہر کو قلعہ بند کرنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ غریب سلطان تو بے دست و پا ہے۔ لیکن فرانس بھی کہ جو اس وقت ملک پر قابض و دخیل ہے۔ اس کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ یہ تو طنجہ ہے کہ جس کے استحکام سے جبل طارق

کی ہستی معرض خطر میں پڑ سکتی تھی۔ برطانیہ عظمیٰ نے تو شہر اسکن ربہ کو جو ہزار ہا میل پرے ایک گوشہ میں پڑا ہوا ہے مستحکم ہونے نہ دیا۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ قسطنطنیہ اور دردانیال کے قلعہ مسمار کرا دیئے۔ طرفہ ماجرا تو یہ ہے کہ مابین اسپین و مغرب اقصیٰ زیرِ زمین دوز راستہ بنانے کے لیئے تو انگلستان ممد و معاون ہے لیکن مابین انگلستان و فرانس انگلش چینل کے درمیان سرنگ بنانے کا سخت مخالف ہے۔ برطانیہ کی دور اندیشی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ طنجہ اور اس کے قرب و جوار کے ۲۵ میل تک کا علاقہ اس طرح پر بین الاقوامی کرا دیا کہ یہاں نہ کوئی قلعہ بنایا جا سکتا ہے نہ توپ و تفنگ رکھی جا سکتی ہے۔ نہ کسی ایک واحد سلطنت کی حکومت ہو سکتی ہے۔ سلطان مغرب اقصیٰ کی حکومت بظاہر بھی نظر نہیں آتی۔ یہ علاقہ ایک انجمن نمایندگان برطانیہ۔ فرانس۔ مغرب اقصیٰ۔ اطالیہ۔ اسپین کے سپرد ہو گیا ہے کہ جو اس کی نظم و نسخ کی مختار ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ انجمن سیاہ و سپید کی مالک ہے اور اگرچہ مغرب کا ایک ممبر بھی شریک ہے لیکن وہ مثل صفر بیکار ہے اس کا اثر اتنا بھی نہیں ہے کہ جتنا کورٹ آف وارڈس پر مقروض و مفلوک الحال تعلقہ دار کے کارندہ کا ہوتا ہے۔ سلطان کو اس خطہ کی حکومت مداخل و مخارج سے کوئی تعلق نہیں۔

طنجہ کے جس قدر باشندے ہیں وہ مختلف سفرا کے زیر حمایت ہیں۔ زیادہ تر فرانسیسی حکومت کے زیر اثر ہیں جس کے بعد اسپین و اطالیہ کا دائرہ اثر ہے۔ انگلستان کی سیادت میں اگرچہ اسوقت یک صد نفوس سے زائد نہیں ہیں لیکن فی الحقیقت سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر سفارت شیر انگلستان ہی کی ہے۔ اس مختصر آبادی کے لیئے جو حکومت ہے اس کے جملہ اعلیٰ عہدیدار یورپی ہیں کیونکہ مسلمان کو جو فی زمانہ ادنیٰ کاموں کے لیئے پیدا ہوا ہے اعلیٰ ملازمت سے کیا سروکار اس کے لیئے چپراس گری۔ بوابی۔ فراشی بہت ہے۔ پولیس میں وہ ہیڈ کانسٹبلی سے آگے قدم

نہیں بڑھاتا اور اگر کبھی کوشش بھی کی تو یورپی اتحاد۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال دیگا کسی مدرسہ کی ہیڈ ماسٹری پر مسلمان نظر نہ آئے گا۔ نہ کسی بڑی دوکان پر عمامہ بند عرب دکھائی دیگا۔ عدالتوں کی کرسیاں اس سے خالی اور کارخانہ جات کے دروازے اس پر بند ہیں۔ دفاتر سائر و ریل میں اس کا گذر کہاں۔ رہا بنک گھر سو اُس میں دیوالیہ کا کیا کام۔

زباندانی بین الاقوامی مرکز ہونے کی وجہ سے طنجہ میں یورپ کی بیشتر زبانیں اس کثرت سے رائج ہیں کہ اکثر دوکاندار فرانسیسی اطالوی۔ اسپانوی۔ جرمنی۔ پرتگالی۔ یونانی میں گفتگو کرسکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے فرانسیسی زبان میں چہکتے پھرتے ہیں۔ عربی مادری زبان ہے۔ اطالوی ترنم کے لئے وقف ہے۔ اسپانوی تجارت کے لئے اور فرانسیسی سرکاری کاروبار کے لئے۔

موسم پچھلی مرتبہ ماہ اگست میں اور اس مرتبہ ماہ دسمبر و جنوری کے کچھ دن مجھے یہاں ٹھیرنے کا اتفاق ہوا۔ اگست میں نہ گرمی کی شکایت ہوئی اور نہ جنوری میں باد زمہریر نے ستایا مقیاس الحرارت کا اوسط ۵۵ درجہ پر تھا۔ اوور کوٹ صرف رات کو پہنتا تھا (ماہ دسمبر میں لکھنؤ اور دہلی میں ۵۰ درجہ کی سردی ہوتی ہے)

بازار بنارس کی طرح بازار تنگ اور پیچدار ہیں۔ نشیب و فراز بھی زیادہ ہے۔ موٹریں کشادہ سڑکوں پر چل نکلی ہیں لیکن تنگ بازاروں میں ممانعت ہے۔ خچر اور گدھا عام سواری ہے اور "خشکی کا جہاز" تو ہر جگہ بلبلاتا پھرتا ہے۔

سب سے بڑا آباد اور بارونق بازار سوق الکبیر وسط شہر میں واقع ہے جس میں متعدد قہوہ خانہ۔ انجمنیں قائم ہیں۔ عربی نغمہ کی خواہش ہو تو کسی قہوہ خانہ میں ایک پیالی قہوہ لیکر بیٹھ جاؤ اور جب تک طبیعت سیر نہ ہو لحن داؤدی اور نغمہ حجاز سنتے رہو۔

فرانسیسی ذخائر غیر ملکی سامان سے معمور ہیں۔ وطن پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہر قوم اپنے ملک کی دوکان سے سامان خریدتی ہے۔ اطالوی ضرورت مند اپنے اطالوی بھائی کی دوکان ہی سے سودا خریدے گا۔ فرانسیسی کا بس جہاں تک چلے گا غیر ملکی دوکان کی طرف رخ نہ کریگا انگریز تو سودیشی کا عاشق اور وارفتہ ہے۔ اگر غیر ملکی دوکان گھر کے پاس اور انگری دوکان دو میل کے فاصلہ پر ہے تو بھی وہ دو میل کی مسافت بخوشی برداشت کر کے اپنے وطنی بھائی کی امداد و دستگیری میں حصہ لے گا رہے عرب سو ان کی کوئی کارگاہ ہے نہ تجارت گاہ۔ ایک چھوٹا سا چشمہ کرایہ پر لے کر یورپ کا ساز و سامان بیچنے بیٹھ گئے۔ نہ کسی جگہ جانے میں شرم دامنگیر ہوتی ہے اور نہ ملک فروشی میں تامل ہوتا ہے۔ جہاں دو پیسہ کا سہارا دیکھا وہاں اپنی فلاکت و بے غیرتی کا ثبوت دینے کو پہنچ گئے۔ ملکی صنعت خانہ جنگی اور غیر قومی تشدد سے تباہ ہو رہی ہے دباغی کے لئے کبھی مغرب مشہور تھا لیکن آج اس کے بازار فرانس کے چمڑے سے بھرے پڑے ہیں۔ قالین بافی محدود ہو گئی۔ اور پارچہ بافی تو ہندوستانی جولاہوں سے بھی گری ہوئی ہے زیور کبھی اچھا بنتا تھا۔ لیکن اب تو یہاں کا بھدا موٹا بدنما زیور کوئی ہندوستانی خاتون بھی پسند نہ کرے گی۔ شمشیر سازی کو بندوق و طمنچہ نے داغ دیا۔ صباغی جرمن رنگوں سے بدرنگ ہو گئی۔ کشتی رانی یورپی ورطہ میں غرق ہو گئی اور شیرازہ علوم و فنون اجنبی حکومت سے پراگندہ ہو گیا۔ مراکش و فاس کی ریشمین کارگاہیں فرانسیسی جال میں الجھ کر بیکار ہو گئیں۔ مسلمان تم کو ہر جگہ ملیں گے مگر بھیک مانگتے ہوئے۔ سڑکوں پر جھاڑو۔۔۔۔ دیتے ہوئے۔ بکریاں چراتے ہوئے۔ فرانسیسی بنک کی چوکیداری پر یونانی دوکان کی بوابی پر۔ اطالوی تھیٹر کی فراشی پر اجنبی ہوٹل کی مگس رانی پر۔ شاہراہ ترقی سے کوسوں پیچھے لیکن ملک فروشی قوم فروشی میں دیگر اقوام عالم سے دوچار ہاتھ آگے!

شرف العقاب اگرچہ اس مقام کی زیارت سے میں پہلے مشرف ہو چکا تھا۔ کیونکہ ۲۴ء
کا سفر مغرب اقصیٰ محض اسی ارض مقدس کی جبہ سائی کے لئے کیا گیا تھا اور اس نقش پا پر کہ
جس نے لوائے اسلام مغرب اقصیٰ تک پہنچا کر اور اعداسے خراج تحسین حاصل کر کے "سکندر
ثانی" کا لقب حاصل کیا تھا۔ اپنی جبین نیاز رگڑ کر اور خوننابہ اشک بہا کر دل کی بھڑاس
نکال چکا تھا۔ لیکن اس مرتبہ بھی ولولہ زیارت کچھ کم نہ تھا اور اگر شریفہ وزان کے پوتہ محمد نے
گھیر نہ لیا ہوتا تو شاید شام ہی کو ساحل اطلانتک پر اشکبار ہونے چلا گیا ہوتا۔ مگر سیدی محمد کی
لچھے دار گفتگو نے مغرب تک پھانس رکھا اور بعد نماز جب شریفہ سے ملنے گیا تو آٹھ بجے سے پہلے
چھٹی نہ مل سکی۔ ۹ ½ بجے تک حسین عونی کی خاطر مدارات میں لگا رہا اور پھر اُن کے ساتھ بارہ ایک
بجے تک شب گردی کرتا رہا۔ لیکن صبح ہوتے ہی دیوانے نے جنگل کی راہ لی۔ جہاں اس
نے نو بجے کے قریب بحر ظلمات کے ساحل پر اپنے آپ کو پایا۔ یہی وہ لواح ہے
جہاں سر آمد غازیان اسلام نے آج سے پونے تیرہ صدی قبل تین سال کی قلیل
مدت میں دس ہزار اہل عرب کی قلیل جمعیت کے ساتھ شمال افریقہ کے وسیع ممالک
جن میں برقہ۔ طرابلس۔ تونس۔ قرطاجنہ۔ جلمہ۔ قسنطینہ۔ الجزائر۔ تلمسان۔ دھران۔ ریف
مغرب اقصیٰ کے اضلاع شامل ہیں۔ زیر کر کے بحر ظلمات میں اپنے شبدیز صبا رفتار
کو جست دے کر دست شمشیر آسمان کی طرف بصد حسرت دیا اس عرض کیا تھا کہ اگر سمندر
حائل نہ ہو گیا ہوتا تو اسی طرح کفر و شرک کی بیخ کنی کر کے تیری توحید کی منادی کرتا
ہوا جاتا۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ عرصۂ عالم ان کے جہاد کے لئے تنگ تھا۔ اور آج یہ
حال ہے کہ خود وہ اپنے گھر سے نکالے جا رہے ہیں۔ شرف العقاب پر نصرانی قبضہ ہے

اور زمانہ مسلمانوں کو ان کے تغافل کی پاداش میں روند رہا ہے۔ اس وقت یہاں کوئی آبادی نہیں ہے پچھلی مرتبہ ایک دو دوکاندار کے جھوپڑے جو دیکھے تھے وہ بھی اب غائب تھے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بوجہ بارش وغیرہ سڑک تک پانی بھرا ہوا تھا۔ تمام علاقہ دلدل بنا ہوا تھا اور میں بجز اس کے کہ موٹر کی چھت پر سوار ہو کر دوربین سے دو تک نظارہ کر لیتا اور کچھ نہ کر سکا۔

علمائے عرب کی جماعت کثیر کا خیال ہے کہ حضرت عقبہ بن نافع نے اپنا گھوڑا صوبہ سوس کے ساحل پر ڈالا تھا۔ لیکن ایک دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ طنجہ سے بارہ میل جانب جنوب اسی مقام پر کہ جس کو "شرف العقاب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ شوقِ جہاد جلوہ نما ہوا تھا۔

المجاہدین شرف العقاب سے واپسی کے وقت میں نے اپنی موٹر اس ٹیکرہ پر رکوائی جہاں مجاہدین اسلام کا ایک سرفروش گروہ برطانیہ عظمیٰ کو شکست فاش دے کر ۲ ½ صدی سے بے نام و نشان چادر خاک اوڑھے محو آرام ہے۔ اس شہر خموشاں کی زیارت آج سے چھ سال قبل کر چکا تھا لیکن وہ ایک سرسری فاتحہ خوانی تھی کہ پانچ منٹ گاڑی میں بیٹھ کر ایک کونہ سے داخل ہوا اور دوسرے گوشہ سے نکل بھاگا۔ اور اب کہ اطمینان سے کئی دن طنجہ میں گذارنا تھے موٹر روک کر حسرت و یاس سے ہر اُس ڈھیر کو۔ ہر اُس تودہ خاک کو۔ ہر اُس ابھری ہوئی چیز کو جس پر قبر کا اطلاق ہو سکتا تھا اور جو تقریباً ۲۔۳ فرلانگ کے دور میں منتشر پڑی ہیں شمار کر رہا تھا۔ اس ناہموار رقبہ میں کتنے ہی زہاد و عباد۔ کتنے ہی اقطاب و اولیاء کتنے ہی اولوالعزم فدائیان اسلام۔ کتنے ہی خنجر آزما شہزادے تہ خاک سو رہے ہیں یہ گنج شہیداں شہر طنجہ کے جنوب و شرقی گوشہ میں واقعہ ہے اور بجز اسپانوی چوپان اور

عربی شتربان کے شاید ہی کوئی گم کردہ راہ ادھر آ بھٹکتا ہو گا۔ تمام میدان کھجور کی جھاڑی اور زیتون و انجیر کی خود رو پودا اور ناگ پھنی کی خار دار باڑھ سے بھرا ہوا ہے۔ مفلوک الحال مسلمانوں میں احاطہ کھچوانے کی استطاعت کہاں۔ خدا جانے میدان المجاہدین اتنا ہی بڑا تھا یا اس کی وسعت کچھ اور زیادہ تھی عجب نہیں جو سامنے والے باغ میں کچھ قبریں آ گئی ہوں کچھ سڑک میں دب گئی ہوں اور کچھ وادی الیسود میں تہ آب ہو گئی ہوں۔ میرے رہبر نے میرے استفسار پر بتلایا کہ ماہ رمضان المبارک میں بعض نیک نفس مسلمان فاتحہ خوانی کو اُدھر آ نکلتے ہیں کیونکہ اس میں بعض بڑے بڑے بزرگ بھی مدفون ہیں۔ وہ دیکھئے ایک بزرگ کا قبہ ہے اور اس گنبد کے نیچے ایک اور ولی اللہ کا مزار ہے۔ یہ سننا تھا کہ میں جو شل بت آرام سے تکیہ لگائے بیٹھا تھا چونکا کسی نامعلوم طاقت نے موٹر سے نیچے اتار پھینکا..... عرق انفعال چہرہ پر تھا کہ موٹر کی گدی پر بیٹھنا داخل گستاخی ہے جس زمین کو شہداء کے خون نے سیراب کیا ہو اس کو آنکھوں سے لگانا چاہیئے۔ قدم قدم پر سجدہ کرنا اور ذرہ ذرہ پر درود و سلام بھیجنا واجب ہی میں اترا اور اور کوٹ کے دامن سنبھالتا ہوا خار دار جھاڑیوں سے بچتا ایک قریب کے گنبد نما مقبرہ میں معتکف ہو گیا۔ اندر ایک ٹوٹی قبر تھی جس پر نہ کوئی کتبہ تھا اور نہ نشان قبر۔

میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہ اس فراموش کردہ وگمنام کان میں کون سا الماس پنہاں ہے۔ یہ کس محروم الفت کا مزار ہے کہ درو دیوار سے اداسی برس رہی ہے۔ پاسبان و مزدر، در کنار۔ قبر پر نہ کوئی چراغ ہے نہ پھول نہ لوح مزار ہے۔ نہ نشان فرسودہ خواب۔ ہو کا عالم ہے۔ خموشی ہر چہار طرف چھائی ہوئی ہے جو آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے؎

کوئی پھول مجھ پہ چڑھائے کیوں　　کوئی اشک مجھ پہ بہائے کیوں
کوئی شمع مجھ پہ جلائے کیوں　　کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

یہ ہے حالت اس گنج شہیداں کی کہ جس کے آرام کنندگان نے ۱۶۸۰ء میں (انگریزوں کو جزیرہ بمبئی ملنے کے بیس سال بعد اور موضع کالی کتہ (کلکتہ) نوابان بنگال سے ملنے سے دس سال قبل بعہد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی) انگریزوں کا اخراج بعد شکست فاش کیا تھا۔ اگر کسی اور قوم کو یہ کامیابی نصیب ہوئی ہوتی تو کتنی ہی یادگاریں قائم ہوگئی ہوتیں۔ لیکن وائے برحال اشراف فلالی کہ اُن کے خاندان کے تیسرے فرمانروا کی فتح ونصرت کی یادگار قائم کرنے کی توفیق کسی کو نہ ہوئی اور اب کہ پندرھواں فرمانروا مسند آرائے خلافت مغرب زیر سیادت فرانس ہے اس کام کی جراءت بھلا کس کو ہوسکتی ہے۔

مزار ابن بطوطہ مدینہ طنجہ کے شرقی حصہ میں ایک شب شوق زیارت مجھ کو اس زاویہ میں لے چلا جہاں سرآمد سیاحان روئے زمین مشرق ومغرب کی تگاپو کے بعد اپنا تکان دور کرنے کے لئے پونے چھ سو سال سے (تاریخ ولادت ابن بطوطہ ۷۰۳ھ وفات ۷۷۸ھ) ایک کوٹھری میں محو خواب ہے۔ اس حصہ آبادی میں ایک گلی ہے جس کا نام اسی مشہور عالم سیاح کے نام نامی پر ہے۔ گلی میں زاویہ ہے اور زاویہ میں تین کوٹھریاں ہیں۔ نو بجے شب کو جب احمد وزانی مجھے اس زیارت گاہ پر لے چلے تو کلیجہ دھک دھک ہو رہا تھا۔ شوق کہتا تھا کہ زاویہ کی سربفلک عمارت قلمی مسودات اور نوادر روزگار سے مالا مال ہوگی لیکن جب ایک بہت ہی مختصر مکان کے اک پہ شکستہ دروازہ پر کہ جس کے متعدد چوبی پیوند خانقاہ کی عسرت وکس مپرسی کا اعلان زبان حال سے کر رہے تھے۔ احمد وزانی نے دستک دی تو دل بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا اور ایک ٹمٹماتی ہوئی دیسی لال ٹین کی روشنی میں تین عقیدتمندان کو کھجور کی بوسیدہ چٹائی پر معتکف پایا۔ کلمات خوش آمدید کے بعد انھوں نے

بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں پاس کی چٹائی پر دیوار سے ٹک گیا۔ چند رسمی جملوں کے بعد میں نے قبر کا نشان پوچھا اور جب یہ بتلایا گیا کہ میں جہانیان جہاں گشت کی قبر پر ہی متمکن ہوں تو خوف وہراس سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گھبرا کر چھلانگ ماری اور مزور بن کے برنس پر جا سنبھلا زبان شکوہ وشکایت سے تیز ہو گئی کہ پہلے سے خبردار کیوں نہ کیا کہ اس بدعت ترک ادب سے باز رہتا۔ کجا وہ دیندار عالم باعمل اور کجا یہ بدکردار ہندی۔ مقام عبرت ہے کہ جس کی تیز گامی نے عرصۂ زمین کو تنگ کر دیا تھا۔ جس کی دشت نوردی نے روئے عالم کی طنابیں کھینچ لی تھیں۔ وہ آج ایک تنگ وتار گوشہ میں کس بے سروسامانی سے پڑا ہوا ہے جس کے سامنے سلاطین وقت طلعت ہائے فاخرانہ نذرانہ کے طور پر پیش کرتے تھے اس کا مرقد آج اس طرح پڑا ہوا ہے کہ نہ کوئی ردا ہے اور نہ تختی جس کی سیاحت سے سلاطین عظام کا نام روشن ہوا ہوا سکی لحد آج اس گمنامی میں پڑی ہوئی ہے کہ خود طنجہ کی بیشتر آبادی اس سے ناواقف ہے۔ اور اگر سیدی عبداللہ جو اسی محلہ میں سکونت پذیر ہیں خبر نہ کرتے تو نہ احمد کو معلوم ہوتا اور نہ مجھے۔ ایک دو منٹ بعد دل قابو میں آیا تو آہستہ سے چٹائی اٹھائی۔ زمین بالکل ہموار تھی۔ نہ قبر کا کوئی نشان تھا نہ لوح مزار تھی اور نہ تعویذ نہ کوئی کتبہ دکھائی دیا۔ اور نہ فرش ہی پختہ نظر آیا۔ یہ حالت دیکھکر دل بیٹھ گیا۔ پھر فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے کہ اس کے سوا ایک تہیدست۔ بے مایہ مسافر اور کیا کر سکتا تھا لیکن تصور سیاح عالم کے نقش قدم پر کبھی افریقہ کبھی یورپ کبھی ایشیا میں رواں دواں تھا۔ قلب ہم کلام تھا کہ اے شہنشاہ سیاحت۔ تیری آنکھوں نے ایشیا۔ افریقہ اور یورپ کے بہت سے انقلابات دیکھے ہوں گے کتنی ہی فرسودہ اقوام تیرے سامنے زوال پذیر اور اولوالعزم شمشیر زن عروج پذیر ہوئی ہوں گی عربی وبربری خونریزیوں کے نقشے تیری نظروں میں بسے ہوں گے۔ زفاق طارق تیرے ہی

سامنے اسلامی خون سے لالہ زار ہوئی ہوگی۔ خدارا اپنی زبان صداقت بیان سے بربر و عرب کی نوحۂ رزم سنادے کہ جس کا شوق غم یہاں تک کشاں کشاں لایا ہے۔ اپنے مشاہدات سے میری محدود معلومات کی جھولی بھر۔ اپنا مبارک ہاتھ میرے سر پر رکھ شمع ہدایت سے میری تیرہ و تار منزل منور کرے

فقیر و خستہ بدرگاہت آمدم رحمے　　　　کہ جز دلائے توام نیست ہیچ دستاویز

قصبہ | مغرب اقصیٰ۔ الجزائر۔ افریقیہ اور اندلس کی اصطلاح میں لفظ قصبہ سے مُراد اس محصور و قلعہ بند آبادی سے ہے جس میں سلطان وقت اور اُس کی عدم موجودگی میں حاکم ضلع مع اپنے حشم و خدم کے سکونت پذیر رہتا ہے۔ ہندوستان میں جو نسبت قلعہ معلی کو شہر دہلی سے اور لال قلعہ کو آگرہ سے تھی یا جو نسبت ٹاور کو شہر لندن سے زمانہ قدیم میں تھی۔ وہی نسبت شمالی افریقہ اور اندلس کے شہروں میں قصبات کی تھی۔ ہر شہر میں ایک قصبہ ہوتا تھا۔ اندلس میں شہر غرناطہ کے قصبہ کے کھنڈر اس وقت تک باقی ہیں۔ طنجہ۔ فاس۔ مراکش۔ رباط وغیرہ کے قصبات قائم و آباد ہیں لیکن دور جدید میں امرائے بیرون شہر کھلے میدانوں کی سکونت اختیار کر لی ہے اور پرانی گنجان آبادی محض غربا کے دم سے باقی ہے۔ طنجہ کا قصبہ بھی زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا یعنی متمول عامل۔ قائد۔ باشا۔ مخزنی وغیرہ کھلی ہوادار جگہوں میں منتقل ہو گئے اور قصبہ صرف مزدوری پیشہ آبادی کا نام رہ گیا ہے۔ قصبہ کی فصیل بھی منہدم ہو چلی ہے۔ پھاٹک شکستہ ہو گئے ہیں۔ راستہ ناہموار اور نشیب و فراز کے باعث تکلیف دہ و دشوار گذار۔

قصبہ میں ایک اسلامی زنانہ مدرسہ ہے جس میں پردہ کا معقول انتظام ہے۔ چند مکتب بھی ہیں۔ اور امراء کے دروازوں پر ایک دو مولوی صاحبان کلام مجید اور حدیث کی تعلیم پر

ضرور دکھائی دیں گے۔

دار المخزن: مغربی اصطلاح میں دار المخزن سکرٹریٹ کو کہتے ہیں۔ سلطان وقت اسی عمارت پر رہتا ہے اور اُس کی غیبت میں اس کا نائب مقیم رہتا ہے۔

طنجہ کا دار المخزن ایک پُرانی وضع کی حویلی ہے اور چونکہ یہ شہر بین الاقوامی پنچایت کے قبضہ اختیار میں چلا گیا ہے اس لئے یہ مکان بے مکیں ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی چند چوبی صندوق دکھلائے جاتے ہیں جن میں خزانہ رہتا تھا۔ حویلی کے اندر چھوٹے چھوٹے متعدد کمرے۔ صحن۔ باورچی خانہ۔ خلوت خانہ۔ دار الشوریٰ۔ تشبیح خانہ موجود ہیں اکثر کمروں کا فرش صاف شفاف ٹائل کا ہے جو خاص اس ملک کی ساخت ہیں۔ یہ عمارت ۱۹۲۴ء میں میں دیکھ چکا تھا لیکن ۱۹۳۰ء میں حسین عونی بے کے ساتھ جب یہ عمارت دیکھ رہا تھا تو چند یورپی سیاحوں نے جو سیر کو آئے ہوئے تھے۔ دار المشورہ کے مختصر کمرہ پر حیرت سے پوچھا کہ اس میں سلطان کا کابینہ کس طرح اجلاس کرتا ہوگا۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا کہ لندن ٹاور کے شاہی مکان سے چھوٹا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی خوابگاہ۔ دار الشوریٰ حرم سرا وغیرہ یورپ کے بیشتر پُرانے محلات سے عرض و طول میں شاید ہی کم ہونگی۔ بکنگھم محل اور قصر ونڈسر دیکھنے کے بعد ٹاور کے تنگ و تاریک کمروں پر حیرت ہوتی ہے کہ ان میں سلطنت انگلستان کے فرمانروا اپنے لوازمات کے ساتھ کس طرح بسر کرتے ہوں۔ والٹر ریلے کا کمرہ جس میں اُس نے تاریخ عالم لکھی ہے۔ ایک معمولی کوٹھری سے زائد کشادہ نہیں ہے۔ شہزادہ ایڈورڈ کی خوابگاہ ایک ناغول معلوم ہوتی ہے۔ شاہی چیپل اس دار المخزن کے تسبیح خانہ سے زائد وسیع نہیں۔ رومتہ الکبریٰ کا فورم جس کی عظمت کا غلغلہ فلک الافلاک تک گونج رہا ہے دیوان عام دہلی کے ایک گوشہ میں آجائے گا۔ عمارت کی عظمت اس کی بلندی یا وسعت سے

نہیں ہوتی بلکہ حوادث عظمیٰ مشہور کر دیتے ہیں یہ دارالمخزن دیکھنے میں ایک معمولی حویلی ہے۔ لیکن اسی جگہ انگلستانی جبروت نے فتحمند اسمٰعیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اسی چوگان میں سفرائے دول سلطان وقت کو سلام کیلئے برہنہ سر کھڑے انتظار کرتے تھے یہی وہ مقام ہے جہاں یورپی سلطنتیں ناروے۔ سویڈن۔ ہالینڈ۔ مغرب اقصیٰ کو ”خراج“ ادا کیا کرتی تھیں۔ پرتگال نے اسی آستانہ پر جبین نیاز جھکا کر اپنے مدفون شہزادہ کی لاش واپس لے جانے کی استدعا کی تھی۔ تاجدار فرانس کی ایک شہزادی کے ساتھ مولائی اسمٰعیل کی شادی کی گفت و شنید اسی دارالشوریٰ کے گوشہ میں ہوئی تھی۔

قصر الصغیر

میری روانگی کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا لیکن قصر الصغیر کی زیارت مقدم تھی۔ مولائی محمد نے منع کیا کہ مفت دردسری اٹھانا پڑے گی۔ قونصل برطانیہ نے لاعلمی ظاہر کر کے ہمت توڑ دی تھی شریفہ وزان کا اعتقاد تھا کہ اس نام کا کوئی مقام اب باقی نہیں رہا لیکن خدا بھلا کرے ابن حمزہ مدرس مدرسہ بنات اسبانیہ و باشندہ سبتہ کا کہ جس نے یقین دلایا کہ مابین سبتہ و طنجہ ایک جگہ اس نام کی ضرور ... ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ عرب کہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا کہ مورخ اندلس کے لئے اس ویرانہ کی زیارت کئے بغیر طنجہ چھوڑنا ناقابل عفو گناہ ہے۔ بالخصوص جبکہ یہ سفر یاران رفتہ کے نقش قدم کی ہی تلاش کے لئے کیا گیا ہو چنانچہ ابن حمزہ سبتی کی معرفت ایک ٹکسی ایک پونڈ میں کی اور علی الصباح چار پی کر اس مقام کو چلا جو قصر الصغیر مرسی المجاز یا قصر المجاز کے نام سے نہر القصر کے دہانہ پر طنجہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر جانب مشرق حالت گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔ راستہ خام۔ ناہموار اور تکلیف دہ تھا۔ موٹر اچھل رہی تھی اور میں بھی اس کے

ساتھ اپنی نشست پر متحرک تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی دشت نوردی کے بعد حمزہ نے ایک ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا۔ موٹر رُکی اور میں اس ارض مقدس پر کہ جو بسم اللہ مجریہا و مرساہا کے نعروں سے کبھی گونجتی ہوگی۔ خونتابہ اشک کا کلس چڑھانے کے لئے اترا۔ یہ ایک چٹیل علاقہ ہے۔ کہ جس کے کنارے سمندر عمیق ہوگیا ہے اور چونکہ سبتہ و طنجہ کے وسط میں واقع ہے۔ اس لئے زمانہ ماضیہ میں ہر دو مقامات کے جانے والوں کے لئے شاید اچھا خاصہ بندرگاہ ہوگا شہر طریفہ کہ جو اولین مسلم جنرل طریف کے نام نامی کی یادگار ہے اور جس کی نسبت سے بوجہ اس کے کہ طریف ہر گذرنے والے جہاز سے خراج یا جزیہ (Tariff) وصول کرتا رہا۔ روئے عالم پر ایک اقتصادی لفظ (Tariff) ایجاد ہوگیا ہے۔ میرے مقابل تھا۔ میں نے دوربین لگائی۔ آس پاس کے علاقہ کو دیکھا۔ کبھی اندلس کے ساحل کو دیکھتا۔ عربی منارۃ النور پر نظریں جما تا۔ جہاں سے عالم تصور جزیرہ شندہ تک سیر کرا لاتا۔ مطلع صاف تھا اور ساحلی عمارات سامنے کھڑی تھیں۔ یہی وہ مرسیٰ ہے جہاں سے بقول مورخین اولین گروہ مجاہدین نے فتح اندلس کے لئے لنگر اٹھایا تھا۔ آبادی برائے نام ہے۔ یعنی چند خس پوش جھونپڑے اور چار پانچ پختہ مگر شکستہ مکانات کے وجود سے قصر الصغیر کا نام قائم ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ خود وہاں کے باشندے اس نام سے ناواقف ہیں۔ میں نے جب دریافت کیا کہ اس آبادی کا کیا نام ہے تو ایک گنوار نے جواب دیا کہ کچھ نہیں میں نے پوچھا کہ کیا قصر الصغیر یہی ہے تو کہا کہ معلوم نہیں۔ اس ناواقف پست ہمت۔ ننگ بربر پر افسوس کیا لیکن بیکار۔ مگر جب اس نے بھیک کے لئے زبان کھولی تو دل پاش پاش ہوگیا۔ آہ فاتحان اندلس اب اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں دھنس جاتا۔ افسوس جس کے آباؤ اجداد سلطنت تقسیم کیا کرتے تھے جن کے امرا کی داد دہش مشہور تھی ان کی اولاد آج ایک مفتوح

غریب۔ ہندی مسافر سے ایک پسیتہ کے لئے دست طلب دراز کر رہی ہے! لیکن زمانہ بدل گیا
آسمان بدل گیا۔ زمین بدل گئی۔ خصائل بدل گئے۔ فاتح مفتوح ہو گئے اور مفتوح فاتح۔ آخر
سقیم الحال عرب کو ایک پسیتہ دے کر اور تھوڑی دیر دشت و جبل دیکھ کر سبتہ کی راہ لی۔

سبتہ

Ceuta

یلیان کی راجدھانی۔ فلورنڈا کی عشرت گاہ۔ فاتحان اندلس کا اولین بندرگاہ یعنی شہر
سبتہ جو اپنی سات پہاڑیوں کی وجہ سے جن میں سے بڑی پہاڑی ۶۳۶ فٹ بلند ہے۔ ایک
خوشنما خاکنائے پر اسی طرح آباد ہے جس طرح وال کیشر بمبئی میں۔ جبل طارق کی طرح یہ بھی
زقاق کی ایک کلید ہے اور اسبانیہ نے خشکی و تری کے راستوں پر مضبوط قلعہ بندی سے
مستحکم کر رکھا ہے لیکن اسبانیہ شیر برطانیہ کی طرح نہ متمول ہے اور نہ مآل اندیش۔ سبتہ محض
انگلستان کے رحم و مدارا پر مامون ہے لیکن اگر کبھی انگلستان و اسبانیہ میں جنگ ہوئی تو ایک
ہی حملہ میں اس کے استحکام زمین بوس اور اس کے باشندے و محافظین مثل سارڈین
مچھلی کہ جو اس ساحل پر بکثرت پائی جاتی ہے زقاق میں غوطہ کھانے لگیں گے۔

مبارک تھی وہ گھڑی جب باب المضربہ پر میری ٹکسی نے مجھ کو اتارا۔ یہ کار قصر الصغیر تک
کے لئے کی گئی تھی اور خیال تھا کہ وہاں زیادہ ٹھیرنا پڑیگا لیکن جب آدھ گھنٹہ کے بعد ہی
وہاں سے فراغت ہو گئی تو ابن حمزہ نے سبتہ چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ باب المضربہ پر
قدم رکھا۔ پولیس کے جمعدار نے میری دوربین اور کیمرا رکھوا لیا کیونکہ اس شہر میں تصویر
کھینچنے کی اجازت نہیں ہے اور اسبانوی بزدلی سمجھو یا خوف جاسوسی کہ دوربین بھی نہ لیجانے
دی۔ خیر۔ ہم دونوں آگے بڑھے اور ابن حمزہ کے مکان پر پہنچے جہاں ان کے چھوٹے

بھائی بہن حمادہ اور آمنہ نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ہندوستانی بچے نو وارد انجان مسافر سے ملنے جلنے سے اکثر شرماتے ہیں لیکن یہ عرب نونہال ابن حمزہ کے اشارہ پر جوانوں کی طرح بڑھ کر دست بوسی کرنے لگے۔ ابن حمزہ کا مکان چھوٹا ہے۔ ایک کمرہ میں نشست گاہ ہے جہاں دو کونوں میں دو صوفے تخت نما پڑے ہوئے ہیں اور ان پر مغربی چھینٹ کی خوشنما گدّے بچھے ہیں۔ آمنہ کلام مجید پڑھتی ہے اور حمادہ اسپانی زبان کی پہلی کتاب ختم کرنیوالا ہے۔ اس شہر کے ہر گلی کوچہ میں اسپانی زبان رائج ہے اور یہ دونوں بھی بے تکلفی سے بات چیت کرتے ہیں۔

ابن حمزہ نے پہلے کھانا کھلایا جس میں حسب معمول کُس کُس کا عنصر غالب تھا۔ اور اس کے بعد سارڈین مچھلی کے دو برتن بھی تھے۔ اسپانی ترتلا اور مالقہ کے گنّے کی گنڈیریاں بھی تھیں۔

کھانے کے بعد سیر کو نکلے۔ کیا بتاؤں کہ یہ آوارہ گرد کن کن آرزوؤں اور تمناؤں کو لے کر نکلا۔ ابھی شارع ذرعہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ تصور رہنمائی کرنے لگا کہ اس راستہ سے اسلامی سالار اعظم حضرت عقبہ بن نافعؓ کا شبدیز آگے بڑھا ہوگا غالباً باب المضربہ کی چوکھٹ پر بلیان نے تحائف پیش کر کے باجگذار رہنے کی استدعا کی ہوگی اسی شمالی بندرگاہ سے یہ قوطی سردار اسلامی وائسرائے و گورنر جنرل حضرت موسیٰ بن نصیرؓ کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوا ہوگا۔ یہ سامنے جو قلعہ ہے اس کی کنجیاں بلیان نے طارقؓ کو پیش کی ہوں گی اور اس بارہ دری میں جو پہاڑی پر نظر آرہی ہے فرندینا نے اپنی بیٹی فلورنڈا کو پیش کر کے اس کی عصمت ریزی کا دھبہ لذریق کے خون سے دھونے کے لئے دہائی مچائی ہوگی۔ اسی جبل منیٰ سے طریف و طارق کو بحیرۂ روم کا

"ونیکرہ" اور اندلس کا مورچہ دکھلایا گیا ہوگا اور اسی بندرگاہ سے چار کشتیاں اولین مجاہدین کو بحر زقاق عبور کرنے کے لئے کہ جس کا فاصلہ مابین سبتہ وجبل الفتح ۱۰-۱۲ میل سے زائد نہیں ہے دی ہوں گی۔ غالباً اسی نہر بلیان کے کنارہ یورپ وافریقہ کا متحدہ اولین کارخانہ کاغذسازی عربوں نے تعمیر کیا ہوگا۔ اسے حصار کے اندر بلیغ جنگ بقدورہ کے بعد محصور ہوا ہوگا اور اسی شہر سے کہنہ سال یوسف بن تاشفین کہ جو اپنی عمر کے اسی منازل طے کرچکا تھا معتمد کی امداد پر روانہ ہوکر جزیرۃ الخضرا میں لنگرانداز ہوا ہوگا یہی وہ شہر ہے جس کی جامع مسجد کو پرتگالی تاجدار "جوا" نے جو اپنے باپ پیڈرو کا حرامی بچہ تھا اور جس کی شادی انگلستان کی شہزادی فلیپا سے ہوئی تھی ۱۴۱۵ء میں کہ جب ہندوستان میں خضر خان کا دور دورہ تھا گرجا گھر بنالیا۔ پرتگالی تاجدار نے ملک مغرب کی خانہ جنگی دیکھ کر سبتہ پر حملہ کردیا تھا جس کی مدافعت کے لئے صلاح بن صلاح اسلامی قائد نے آس پاس کے بربری قبائل انجیرہ۔ غمارہ۔ بنی مسوار۔ بنی احمز۔ بنی سعید۔ بنی ہسمار کو فراہم کیا لیکن پرتگالی بیڑہ قریب پہنچ کر طوفان سے منتشر ہوگیا صلاح نے بیڑے کو واپس جاتے دیکھ کر خیال کیا کہ یہ لوگ چلے گئے اس لئے بربری قبائل بھی اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے لیکن چند روز بعد وہ پھر نمودار ہوئے مسلمانوں کو زک ہوئی۔ نصاریٰ نے شہر میں داخل ہوتے ہی مسجد کو گرجا بنایا جو اب تک کلیسا بنی ہوئی ہے۔ اسی تاجدار کا ایک بیٹا بعد میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوا اور فاس میں مرگیا جہاں سلطان نے اس کی قبر بنوا کر دفن کیا لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی لاش اشبونہ بھجوادی گئی۔

آبادی کے دو حصہ ہیں قدیم وجدید۔ قدیم شہر پہاڑی کے دامن میں آباد ہے اور بہت گنجان لیکن ویران ہے۔ جدید شہر خوش وضع لیکن سنسان ہے۔ قدیم آبادی میں

عرب و بربر آبادی ہے لیکن ان کی نسل بوجہ افلاس وجہل کم ہو رہی ہے. نصرانی آبادی ہر وقت ہتھیار بند رہتی ہے۔ باوجودیکہ عربی آبادی نہتی ہے اور کسی عرب کو ہتھیار رکھنو کی اجازت نہیں لیکن پھر بھی مسلح اسپانی باشندہ اس قدر خائف ولرزاں رہتا ہے کہ کسی معمولی مسکین عرب نے بھی تیوری چڑھا کر دیکھا اور اس کے ہوش وحواس غائب ہو گئے۔ عربی شوق جہاد و عشق شہادت کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی بات پر عرب مارنے اور مرنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ ان کا ایک ایک فرد دس دس نصرانی پر بھاری ہے ایک عربی للکار پر اسپانی کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر اسپانی باہر نکلتے وقت ہتھیار لے کر نکلتا ہے۔

عرب و بربر بہت مفلوک الحال ہیں۔ ان کی تجارت صرف سبز ترکاری۔ گوشت لکڑی۔ کوئلہ تک محدود ہے۔ بیشتر حمالی کرتے ہیں بعض بکریاں چراتے ہیں اور اپنی بدبختی پر روتے ہیں حکومت ان کی تعلیم وترقی سے گھبراتی ہے اور ڈرتی ہے کہ یہ چنگاری پھر شعلہ فشاں نہ ہو جائے اس لئے ہر ممکن طریقہ سے تباہ کیا جا رہا ہے۔

بندرگاہ آزاد ہے یعنی مال درآمد پر کسی قسم کا ٹکس نہیں ہے جبل طارق بھی آزاد بندرگاہ ہے۔ یہاں زیادہ اسپانوی مال آتا ہے اور مالقہ وجزیرۃ الخضرا اس کی خاص منڈیاں ہیں۔

آثار قدیمہ میں چند عمارات (قلعہ کہ جس کے دیکھنے کی اجازت نہیں ملی. قصر ملیان، باقی ہیں فصیل شہر عبدالرحمٰن الناصر اموی سلطان قرطبہ کی تعمیر کردہ ہے۔ بزرگان دین میں سے ابی ذرعہ اور ابوالعباس کے مزارات پر فاتحہ خوانی کی سعادت مجھے نصیب ہوئی نہر ملیان میں بارش کا پانی کبھی جمع ہو جاتا ہے ورنہ عام طور سے خشک رہتی ہے شہر

میں پانی کی بڑی کمی ہے۔ عام ضروریات کے لئے سمندر کا شور پانی استعمال کیا جاتا ہے پینے کے لئے برسات کا یا آس پاس کے چشموں کا پانی کام میں آتا ہے۔

سبتہ میں میرا ارادہ شب باشی کا نہ تھا لیکن ابن حمزہ نے نہ مانا اور مجھے انھیں کے مکان پر رات تیر کرنا پڑی۔ کیونکہ عربی اخلاق ہوٹل کی راہ میں حائل تھا۔ یہ لوگ زمین پر سوتے ہیں۔ میرے لئے پلنگ کا انتظام کرنا چاہا لیکن میں نے قسم دیکر منع کیا اور اپنے میزبان کی طرح دیوان خانہ کے فرش پر ہی کہ جہاں انھوں نے بستر جما دیا تھا اچھی طرح رات گذاری۔ یہ مکان ایک گلی میں ہے جس کے پاس شارع ذریعہ رات بھر چلتی رہتی ہے۔

یہاں سے بارہ بجے کی ریل میں چلا۔ ریل اسپانوی ہے اور اسی لئے نہایت خراب اور سست رفتار ہے۔ تطوان تک چھ اسٹیشن ہیں (میر مار کسیطینجوس۔ دار الریفین۔ النکرد۔ فم الفق الملالیین) اور ۳۰ کیلومیٹر کا فاصلہ لیکن سوا گھنٹہ طے کرنے میں لگا!

تطاوین (یا) تیطاوین

طنجہ سے تقریباً ۴۰ اور سبتہ سے ۳۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر یہ تاریخی شہر جسے سلطنت فاس کے ثابت عمر نے ۱۳۱۰ء میں بوقت محاصرہ غرناطہ آباد کیا تھا لیکن جس کی تعمیر وخوشنمائی کا طرۂ امتیاز خارج البلد فلاکت زدہ مسلمانان غرناطہ کی دستار کو زیبا ہے۔ ایک خوشنما سرسبز وشاداب مرغزار موسومہ بہ وادی الھوز میں متصل رود مرتل واقع ہے۔ اگرچہ اسپانوی نصاریٰ کی تاخت وتاراج اور کشت وخون سے یہ محفوظ نہ رہ سکا اور اس وقت بھی ہر قسم کی ملکی وسیاسی تہدید کا ہدف بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی غرناطہ کی مٹی ہوئی شوکت۔ فراموش کردہ اسلامی تہذیب ومعاشرت کی ایک دھندلی جھلک

اگر کسی کو منظور رہے تو سیاحت مغرب اقصیٰ میں شہر تیطوان کو نہ چھوڑنا چاہیئے، اندلس کی شمع تہذیب گل ہو چکی۔ قرطبہ کا رصافہ اجڑ گیا۔ قصر زہرا زاغ و زغن کا آشیانہ اور الحمرا عنکبوت کی کارگاہ ہو گئے ہیں۔ اسلام کا نام ونشان ساحل وادی الکبیر سے مٹ گیا لیکن مہاجرین کا وہ رہا سہا قافلہ جسے رہبانی تعصب اور نصرانی شقاوت نے خانماں برباد کر کے بے آب ودانہ برہنہ پا برہنہ سر بیک بینی و دو گوش ملک بدر کر دیا تھا اس نے صوبہ ریف کے اس گوشہ میں پناہ لے کر اپنی تدبیر محنت وجفاکشی تجربہ و فراست سے اس کو گلزار کر دیا۔ شہر کی مستحکم حویلیاں۔ سبک بارہ دریاں۔ مکانات کے صاف صحن۔ صحن کے بلوری حوض اس کے گرد اگرد چنبیلی کی بیل۔ نارنگی کے درخت۔ چوطرفہ مرمری غلام گردش۔ دیوان خانہ کے ریشمی گاؤ تکیہ چھوٹے چھوٹے قالین۔ اُن پر نازک خوبصورت میزیں۔ شہ نشیں کے ستون چھت کی گلکاری۔ خوشنما اینٹوں کا اجارہ۔ پھر عربوں کا سادہ ڈھیلا ڈھالا لباس۔ سفید گھنڈی دار کرتہ۔ سفید دامن دوختہ اونی عبا سفید اونچا شرعی پاجامہ۔ زرد گھیتلا جوتہ۔ اور ان پر سیدی احمد مالقی کے خوش رو بھولے بچوں کی اچھل کود ایسی نہ تھی کہ میں اپنے میزبان کی انگنائی میں پہنچکر جہاں مولائے وزان کے تعارف پر قہوہ کے لئے مدعو کیا گیا تھا محو نہ ہو جاتا۔ اندلسی معاشرت کا یہ مٹا ہوا گہوارہ دولت بنو نصر کا تباہ شدہ قصر۔ انصار مدینہ کی اجڑی ہوئی بستی۔ وادی بشارات کا کملایا ہوا پھول۔ گلزار احمر کا لالہ صحرائی۔ وادی ہوز میں اپنے ورود مغرب کے چار روز بعد دیکھکر دل بھر آیا آنکھیں پُر نم ہونے کو تھیں کہ حضرت سیدی احمد کی خوش آمدید نے اس مسرت جانگداز۔ شادی غمناک کے سحر سے نکال کر شہ نشیں کے آرام وہ تکیہ سے لگا دیا۔ قہوہ سے اور وہ بھی تلخ گاڑھے تلچھٹ نما عربی قہوہ سے کس روسیاہ کو رغبت ہو

لیکن جس وقت ایک پیالی "یاد" غرناطہ کے نام سے پیش کی گئی تو اس نیم مُردہ جسم میں جان آگئی اور آب حیوان کی طرح اس کو نوش کر کے دیر تک مزہ لیتا رہا۔

سیدی احمد خانوادہ بنو نصر کی ایک دور افتادہ شاخ سے کہ جس نے مالقہ میں سکونت اختیار کر لی تھی تعلق رکھتے ہیں۔ تباہی اسلام پر ان کے جد اعلیٰ سیدی ابو بکر بھی گردش میں آگئے اور وطن آبائی کو خیر باد کہنا پڑا۔ چنانچہ آج سے چار صدی قبل جس وقت سیدی ابو بکر کا لٹا ہوا قافلہ ساحل سبتہ پر اُترا تو دو وقت کا فاقہ ہو چکا تھا۔ اثاثہ میں بجز اُن بوسیدہ کپڑوں کے کہ جو جسم پر تھے اور کوئی چیز نہ تھی۔ سبتہ کے چند خدا ترس عربوں نے جوار کا ایک بورہ دیدیا جس پر دو تین روز بسر کیے۔ پھر شرم و حیا کو چھوڑ کر محنت مزدوری کے لئے کمر ہمت باندھی اور ایک بربری زمیندار کی ملازمت قبول کر کے زن و مرد زراعت میں بھڑ گئے۔ خداوند کریم نے محنت کا اجر عطا کیا اور غلہ جو اس سرزمین میں چار پانچ گنا سے زائد نہ ہوتا تھا پندرہ گنا پیدا ہونے لگا۔ چند سال بعد جب ابو بکر کے پاس کچھ پونجی جمع ہو گئی تو ایک قطعہ آراضی خفیف لگان پر لے کر باغ نصب کیا کہ جس میں یہ ماہر تھے۔ رفتہ رفتہ جائداد بڑھانا شروع کی ان کے انتقال پر یہ لوگ پھر تباہ ہو گئے لیکن اب پچاس سال سے یہ خاندان پھر ابھرا ہے اور اس وقت سیدی احمد کہ جو ابو بکر سے دسویں پشت میں ہیں متعدد کوٹھیوں کے مالک ہیں اور ان کے باغات کی پیداوار (سیب۔ نارنگی۔ آلو بخارا۔ انگور کشمش۔ زرد آلو) سے جبل طارق۔ الخضرا سپین روخ طریفہ قادس کے بازار پٹے رہتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کبھی مالقہ بھی تشریف لے گئے۔ جواب دیا کبھی نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ تو چند گھنٹوں میں اپنے وطن آبائی کی زیارت کر سکتے ہیں۔

احمد۔ لیکن اب ہمارا یہ وطن ہے تیطوان میں کئی سو اندلسی خاندانوں کی بدولت یہ کوہستان قائمۃ الاندلس ہو گیا ہے۔ وہاں جاکر کیا دیکھیں کس سے ملیں لیکن اس قصہ کو چھوڑیئے کیا آپ یہاں پہلی دفعہ آئے۔ ہندوستان کیسا ملک ہے (انھوں نے اسبانوی خفیہ پولیس کے خوف سے اسبانیہ اور تیطوان کی گفتگو قصداً ترک کردی)

میں۔ اچھا سیدی آپ کے پاس اسلامی اندلس کی یادگاریں بھی ہیں۔

احمد۔ سیدی اب میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ جو تھیں وہ سب شکست یا کم ہو گئیں آپ مسلمان اپنے ملک میں آرام و آسایش اور آزادی سے رہتے ہیں.... مسلمان کتنی ہونگے .... مرفع الحال ہیں؟ .... آپ کا گھر کہاں ہے۔

میں (سرسری طور پر جوابات دیکر) جنوب اندلس میں کوئی مسلمان بھی آباد ہے یا نہیں۔

احمد۔ نہیں .... ہندوستان میں نصاریٰ کتنے ہیں۔ اسبانیہ کے کتنے باشندے وہاں ہوں گے .... آپ کب تک مغرب میں قیام کریں گے۔

میں۔ آپ اس قدر خائف کیوں ہیں۔ اسبانیہ کا خوف اس قدر ٹھیک نہیں۔

احمد۔ ہم بالکل نہیں ڈرتے ہیں حکومت اسبانیہ میں بہت آرام ہے .... ہندی مستورات پردہ کرتی ہیں یا نہیں۔ عربی تعلیم ہندوستان میں کیسی ہے۔

میں۔ آپ کی اولاد کو اسبانوی حکومت ملازمت دیتی ہے۔

احمد۔ ہاں۔ ہندوستان میں ملازمت کا کیا حال ہے۔

میں۔ اس وقت کتنے اندلسی عرب ملازم حکومت ہوں گے۔ سب سے بڑا مشاہرہ کیا ملتا ہوگا۔

احمد۔ ٹھیک حال ہم کو معلوم نہیں۔ ہم زراعت و تجارت پیشہ ملکی معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے۔ آپ کے روز میں اپنے وطن پہنچیں گے۔

میں۔ سیدی آپ کے پاس سلاطین اندلس کی تصاویر بھی ہوں گی۔

احمد۔ تصویر رکھنا گناہ ہے۔ کیا ہندوستان میں تصویر رکھتے ہیں۔

میں۔ قرطبہ کی مسجد اگر آپ کو مل جائے تو اس کو آباد رکھ سکتے ہیں۔

احمد۔ نہیں۔

غرضکہ تھوڑی دیر کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ اندلسی عربی آبادی تیطاوین مُردہ ہو گئی ہے روح نکل چکی ہے ڈھانچہ باقی ہے اور اگر اسپانوی استبداد اسی طرح قائم رہا تو یہ لوگ بھی آب مطہر اور صلیب مقدس کے پرستاروں میں جبراً داخل کر لئے جائیں گے ورنہ کسی بغاوت یا شورش کے الزام میں توپ کے منہ سے اڑا دیئے جائیں گے میں ایک گھنٹہ ان کے پاس رہا لیکن اس عرصہ میں انھوں نے اپنے سوالات کی بوچھار سے تنگ کر دیا تیطوان اور نیز دیگر مقامات افریقہ کی سیاحت نے میری آنکھیں کھول دیں کہ ہندوستان میں کسقدر آزادی نصیب ہے۔ اور رعایائے ہند حکومت پر کس آزادی و بے باکی سے نکتہ چینی کرتی ہو

تیطاوین ہی کو کہ جسکو بعض لوگ تبطوان اور تطوان بھی لکھتے ہیں غرناطہ کے قائد اعظم ابوالحسن مندری نے زوال سلطنت بنو احمر پر اپنا ملجا بنا کر قرب و جوار کی نصرانی آبادی بالخصوص سبتہ اور طنجہ پر جو ضعف سلطنت کے باعث بار بار پرتگالی و اسپانی حکومت کے تحت میں چلے گئے تھے یورش کرتا رہا سمندر کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا اور اسپانیہ و پرتگال ابوالحسن کے نام سے تھراتے تھے لیکن اب تو ۱۹۱۳ء سے یہ شہر مستقل طور پر اسپانیہ کے استبدادی شکنجہ میں کس گیا ہے۔

تطوان لوہے اور پیتل کے کام کے لئے مشہور ہے۔ کم وبیش ۵۰ دوکانوں پر عرب کاریگروں کی بنائی ہوئی تلواریں۔ زرہیں۔ خود پیش قبض۔ صراحیاں طشت۔ آفتابہ شمعدان۔ ڈبیاں صندوقچے رکھے ہوئے ملیں گے۔ یورپ کا شاید ہی کوئی بدشوق سیاح ہوگا جو اس طرف نہ آیا ہوگا۔ ہر یورپی جو ایک ماہ کے لئے سفر مغرب اقصیٰ کرتا ہے وہ ایک دن تطوان کے لئے ضرور نکالتا ہے۔ عربی دستکاری اس گئی گذری حالت میں بھی اپنے باریک و نفیس کام کی وجہ سے خراج تحسین و آفریں حاصل کرتی رہتی ہے اور ہر سیاح کوئی نہ کوئی سوغات اپنے اعزا و احباب کے لئے یہاں سے ضرور خرید کرتا ہے۔

تطوان کے اندلسی عرب مقابلتہً خوشحال۔ خوش پوش۔ خوش خلق۔ خوش عقیدہ اور خوبصورت ہیں۔

یہ شہر مقبوضات اسبانیہ کا صدر مقام یعنی اسبانوی گورنر۔ دیسی خلیفہ اور دیسی پاشا کا مستقر ہے۔ خلیفہ کا اقتدار مثل گورنر ہونا چاہیئے اور پاشا مثل کلکٹر ضلع ہوتا ہے۔ لیکن دونوں چونکہ "دیسی" ہیں اس لئے اجنبی حکومت میں ہر دو افسران نصرانی گورنر کے اشارہ پر چلتے ہیں۔ منطقہ الاسبانیہ کا خلیفہ مولائی الحسن بن المہدی بن اسمٰعیل اور باشائے تطوان السید الحاج ادریس الریفی تھے۔ سابق الذکر ایک نوعمر نوخیز خوشرو و ناتجربہ کار طفل مکتب ہے اور موخر الذکر ایک خوشامدی جی حضوری۔ میرا جی ملنے کو چاہا لیکن معلوم ہوا کہ جب تک گورنر کی اجازت حاصل نہ کریں گے انھیں اجنبی مسافر سے ملنے کی جرارت نہ ہوگی۔ میرے پاس وقت بھی کم تھا اور جو کچھ تھا وہ سیدی احمد کے آستانہ پر نذر ہو چکا تھا اس لئے یہاں سے فارغ ہو کر طنجہ کو واپس چلا۔

علاقہ ریف کہ جس میں تیطوان شامل ہے میوہ جات کی بڑی منڈی ہے۔ انگور، انجیر

انار۔ خربزہ جو میں نے تیطوان میں کھایا یا دیکھا اعلیٰ ترین قسم کا تھا۔ انگور آلو بخارہ کے برابر اور انجیر چھوٹے سیب کے برابر دیکھنے میں آیا۔ تمام علاقہ باوجود کوہستانی ہونے کے افغانستان کی طرح میوہ جات سے لدا ہوا ہے۔

قومی خصائل بھی بہت اچھے ہیں۔ خون غیرت قومی اور جوش مذہبی سے ہر وقت گرم رہتا ہے۔ شجاعت مہمان نوازی ہمدردی اور جفاکشی... قومی شعار ہیں۔ زن و مرد بچے بوڑھے محنت کے عادی۔ سپہ گری کے شیدا اور جام شہادت کے تشنہ دکھائی دیں گے۔ کوئی مسافر بغیر ضیافت کھائے جانے نہ پائے گا۔ زنانہ حُسن جو شانہ و آئینہ سے بیشتر بے نیاز ہے شام و عراق کے اُمرا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جس قدر اندرون کوہستان جاؤگے اسیقدر پرستان قریب ہوتا جائے گا شیشوان سے تفاح تک اور ملیلہ (تا مللت، سے سیدی بوخزائن تک کا علاقہ یہاں کا کوہ قاف ہے۔

تلیدی میں جو ایک دشوار گذار مقام ہے غرناطہ کی گم شدہ کتابوں کی کافی تعداد موجود ہے لیکن میرے پاس ریف کے ناہموار علاقہ میں ٹٹو یا گدھے پر سفر کرنے کے لئے نہ وقت تھا اور نہ ہمت۔

اصیلا

ابھی صبح کے سات بجے تھے۔ شبنم اور کہر کی چادر میں سلطان فلک انگڑائیاں لے رہا تھا کہ میری موٹر ہوٹل اسپانوال کے سامنے رُکی۔ دربان نے دروازہ کھولا اور شوفر کو نصف پسینہ بخشش دے کر گرتا پڑتا ہوٹل میں داخل ہوا جس کی ڈیوڑھی میں ایک انگیٹھی کی دہکتی ہوئی آگ نے بے اختیار اپنی طرف کھینچا اور میں بدقت دستانہ اتار کر جو سردی کی وجہ سے

چپک سے گئے تھے ہاتھ۔ ٹانگیں اور پیٹھ کو کھڑے کھڑے سینکنے لگا۔ جب ذرا گرمی آئی تو فرانسیسی قہوہ کا بڑا پیالہ پیکر شہر اصیلا کے حالات اپنے یہودی انگریزی داں رہبر سے کہ جو ہوٹل کی معرفت ایک گھنٹہ کے لئے ایک پسیتہ کے معاوضہ میں آگیا تھا پوچھنے لگا جو وثوق کے ساتھ یوں گویا ہوا کہ زمانہ قدیم میں جب شام سے سوئزرلینڈ تک فینقی حکومت کا دور دورہ تھا یہ شہر ایک تجارتی منڈی تھا لیکن رومہ کے تاخت و تاراج سے محفوظ نہ رہ سکا اور یورپی حسد اور غارت گری سے وہ مثل قرطاجنہ ایک تودہ خاک ہو کر رہ گیا۔ قوم نارمن بھی دست درازی کے لئے بڑھی لیکن بربر قوم نے ان کو خوب کچل ڈالا مسلمانوں کے زمانہ میں یہاں کے دیسی نصاریٰ نے یورپ کے نصرانیوں کو ترغیب و تحریص دی کہ اس شہر پر آنکر قبضہ کریں۔ چنانچہ یورپ کے اکثر غارت گر آئے لیکن عربی خنجر کے سامنے آگے بڑھ نہ سکے لیکن ۱۴۷۱ء اسلام کے لئے بُرا سال تھا کیونکہ پرتگالی بادشاہ الفانزو تین سو جہازوں کا بیڑہ اور ۳۰۰۰۰ ہزار فوج لے کر اصیلا پر ٹوٹ پڑا۔ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی سعید الوطاسی فاس کا محاصرہ کئے ہوئے تھا خاندان مرینیین ختم ہو چکا تھا۔ پرتگالیوں کو کامیابی ہوئی اور وہ قتل وغارت گری کے بعد شہزادہ محمد کو اپنے ساتھ پرتگال لے گئے جبکہ سات سال بعد جب رہائی نصیب ہوئی تو اس نے شہر اصیلا پر چڑھائی کر کے مسلمانوں کو نصرانی قیود سے آزاد کرایا۔ اور اس مسجد کو جسے عیسائیوں نے گرجا بنالیا تھا پھر خانۂ خدا بنایا یہی وہ شہزادہ محمد ہے جسے تاریخ میں محمد پرتگالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس وقت جو بلند عمارتیں نظر آتی ہیں یہ زمانہ حال کی ہیں کہ جس میں اسپانی بنک اور اسپانی معسکر قابل ذکر ہیں اور یہ باغ جو سامنے نظر آتا ہے اس کو سابق عامل اسبانیہ نے نصب کرایا تھا۔ حکومت اسبانیہ سے ہر سال اس کی غور و پرداخت پر ایک رقم ملا کرتی

تھی لیکن نمک حرام اسپانی ملازم کھا جاتے تھے۔ لیکن موجودہ سخت گیر حکومت کے زمانہ میں
کسی کو ایسی جرأت نہیں ہو سکتی اور یہ جدید سبزہ زار شاہ الفانزو کے عہد کی آخری یادگار ہے
شہر میں جو ایک قصبہ سے زیادہ وقیع نہیں چار پانچ مساجد ہیں جن میں سب سے
وسیع جامع مسجد ہے اس کے دالان میں ایک مولوی صاحب پندرہ بیس لڑکوں کو کلام مجید
پڑھا رہے تھے۔ اسلامی مدرسہ کوئی نہیں ہے اسپانی اسکول جاری ہے لیکن اس سے
یہود و نصاریٰ مستفید ہوتے ہیں۔ اسپانی باشندوں کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے شہر میں
عام طور سے عربی بولی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسپانی زبان کا نمبر ہے۔ ایک تماشہ گاہ بھی
ہے جس میں سینما اور تھیٹر کے کھیل ہفتہ وار ہوتے ہیں۔

اصیلا میں خاندان الرسونی کے چند افراد آباد ہیں۔ وسط شہر میں جو سر بفلک عمارات
کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے کبھی ان کے ملک میں تھا مگر اب اسپانوی عمال۔ اسپانوی فوج اور انشا
اسپانوی شفاخانہ سے آباد ہے۔ الرسونی کا خاندان جس کے نام سے آج سے تیس چالیس سال
قبل اہل یورپ لرزہ براندام ہو جاتے تھے اور جس کی تاخت و تاراج سے طنجہ کے یورپی و امریکنی
تجار محفوظ نہ رہ سکے جس کی شکایت میں ہیرس نامی نامہ نگار لندن ٹائمز نے اپنی اسیری کی
داستان میں کالم کے کالم سیاہ کر ڈالے جس کے پنجہ سے روز روشن میں امریکہ کا متمول سوداگر
پرڈکارس بھی نہ بچ سکا اور جب تک دو لاکھ روپیہ فدیہ نہ ادا کیا گلو خلاصی نہ ہو سکی۔ اسی
خاندان رسونی کے افراد آج اسپانوی پنشنوں پر جان دے رہے ہیں۔ غالباً اسی خاندان کے
ایک رکن ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آئے تھے۔

العرائش

گھڑی کی سوئی چار پر پہنچی ہو گی ۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بحر اطلانتک سے ہمکنار ہو کر آ رہے تھے کہ موٹر نے زاویہ للمنا نہ کا طواف کرتے ہوئے مجھ کو آن واحد میں یونانیوں کی فردوس بریں ۔ جنوں کی عشرت کدہ ۔ اسپر آئیڈیس کی پرستان اور ہرقل پہلوان کی گیارھویں رزمگاہ میں پہنچا دیا ۔ اور میں نے اپنے آپ کو اس شہر میں جہاں یونانی دیبی جنوں نے اپنے نکاح کے وقت اپنے شوہر دیوتا جوپیٹر کو ایسی خوبصورت طلائی نارنگیاں دی تھیں جن کی حفاظت زمین پر اژدھے فضائے بالا میں پریاں کرتی تھیں پایا ۔ انگریزی خواں ناظرین سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جنو اور جوپیٹر حقیقی بھائی بہن تھے ۔ جنو کے برق جمال نے اپنے حقیقی بھائی جوپیٹر کا خرمن زہد و ورع خاک سیاہ کر کے اس کو متوالا کر دیا لیکن جنو نے بے اعتنائی و بے رخی برتی ۔ آخر جوپیٹر ایک چال چلا اور آندھی اور طوفان کو حکم دیا کہ تمام مطلع پر چھا جائیں ۔ چنانچہ طوفان آ گیا ۔ آندھی چلنے لگی ۔ بادل گھر گئے ۔ بجلی چمکنے لگی ۔ بارش ہونے لگی ۔ جوپیٹر کوئل کی شکل میں منقلب ہو گیا اور باد و بارش سے پریشان ہو کر ادھر ادھر اڑنے لگا ۔ دیبی جنو کو پرندہ کی سراسیمگی پر ترس آ گیا اور اس نے اس کو پکڑ کر چھاتی سے لگا لیا ۔ لیکن گود میں بٹھانا تھا کہ اخی مکرم والمعظم اپنی اصلی شکل میں ظہور پذیر ہو کر ہمشیرہ عزیزہ کی صحبت سے بہرہ اندوز ہونے لگے ۔ آخر بہن کو بھی کوئی چارہ کار نہ رہا اور اس نے بھائی صاحب قبلہ سے شادی کر لی ۔ نکاح کے وقت اس نے ایک "سنہرا سیب" یا نارنگی العرائش کے فردوس بریں کا تحفہ میں نذر کیا ۔

یہ ہے ایک معمولی فرضی قصہ جس پر یونانی مبالغہ اور توہم نے سینکڑوں قصہ گھڑ لئے ۔ یہی وہ نارنگی ہے جس کو لانے کے لئے یونانی رستم ہرقل کو گیارھویں بار العرائش کا سفر کرنا پڑا تھا ۔

اور بالآخر سمندر کے دیوتا کی امداد سے اژدہے کو مار کر نارنگیاں توڑنے میں کامیاب ہوا۔ زمانہ کی نیرنگی دیکھو کہ تاج الملوک اور بکاولی کے مصائب اپنے ہی ملک میں خارج از عقل و وہم قرار دیدیئے گئے ہیں لیکن ہرقل کی داستان اور جنو کی بدکاریاں ہندوستان میں زیب مجلس بنی ہوئی ہیں۔ بہرحال جس شہر کے عجائبات سے یونانی مثنویاں۔ انگریزی منظومات اطالیہ کے گیت اور فرانس کے نغمے معمور ہیں اسی طلسم ہوش ربا کے پرپیچ و سنگلاخ گلیوں میں میں اس وقت کہ چار بجے ہیں کھڑا ہوا تھا اور حیران تھا کہ اس نیم ویران اور بے رونق معمورہ میں یونانی پریاں کہاں رہتی ہوں گی۔ نارنگی کا درخت کس جگہ نصب تھا اور ہرقل نے اژدھے کو کہاں مارا تھا۔ نارنگیاں کسی زمانہ میں شاید اچھی ہوتی ہوں لیکن اس وقت تو سامنے کی دو دکانوں میں چھوٹی چھوٹی رکھی ہوئی ہیں۔ راستہ میں کارک کا جنگل تو دیکھا۔ لیکن نارنگیوں کے باغ نظر نہیں آئے۔

یہ شہر بربری قبیلہ "بنی عروس" نے ایک چھوٹی پہاڑی پر دریائے لقوس کے دہانہ پر آباد کیا تھا اور اسی مناسبت سے کسی قدر ترمیم کے بعد العرائش کہلانے لگا۔ مجھے یہاں نہ یونانی جنت کے دیدار کا شوق تھا اور نہ جنو قحبہ کے چھنال پنے سے سروکار تھا۔ میں صرف اسلامی مقام کے خیال سے یہاں آیا تھا اور اس خیال سے کہ اس کو شہزادہ محمد الشیخ نے اطالوی تجار کی صلاح و مشورہ پر ایک لاکھ دینار کے معاوضہ میں اسبانیہ کو دینا منظور کر لیا تھا دیکھنا چاہتا تھا۔ محمد الشیخ ابوفارس اور زیدان اپنے والد کی وفات پر دعویدار تخت و تاج مغرب ہوئے۔ محمد نے یہ شہر اسبانیہ کو رشوت میں پیش کیا لیکن جنگ نے پلٹا کھایا۔ محمد ناکام رہا اور زیدان کے ہاتھ معرکہ رہا۔ اسی شہر میں عرصہ دراز کے بعد مولائی اسمٰعیل کو پرتگالیوں پر نمایاں کامیابی ہوئی تھی اور مال غنیمت میں ۸۰ توپیں ہاتھ لگی تھیں۔ فرانس نے بھی ایک بار ۱۷۶۵ء میں یہاں ہزیمت

کھائی اور اس کے تمام جہاز جلا دیئے گئے۔

لیکن شہر میں کوئی چیز قابل دید نہیں ہے۔ تاریخی آثار صنادید میں صرف القشلہ نامی بارکیں شکستہ حالت میں پڑی ہیں اور بس۔ کہتے ہیں کہ شہر پناہ اسپانی مزدوروں نے تعمیر کی تھی۔ بازار میں صرف چوک کا بازار اچھا ہے اور تھوڑی بہت چہل پہل نظر آتی ہے۔ مزارات میں سید للہ منانہ اور مولائی عبد القادر کی زیارت گاہ مشہور ہیں لیکن مجھے جانیکا موقعہ نہ مل سکا۔

القصر الکبیر

طنجہ سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر فاس جاتے ہوئے یعقوب المنصور کا تعمیر کردہ شہر دریائے لقوس کے نشیبی ساحل پر کہ جہاں مرطوب آب وہوا سے تپ لرزہ کی عام شکایت رہتی ہے۔ اپنی بارہ ہزار آبادی کو ایک بے رونق اور خستہ حالت میں لئے پڑا ہے۔ میری موٹر آدھ گھنٹہ ٹھیری ہوگی اور اس عرصہ میں میں نے یہاں کے مقابر و مساجد اور زاویوں کا جس میں حضرت مولائی علی ابو غالب اور ابوالحسن اندلسی کی ارواح قدسیہ آرام پذیر ہیں طواف کر لیا۔ جامع مسجد کے دروازہ پر امام احمد نے گنج شہیداں کا پتہ بھی بتلایا مشہور ہے کہ اسی نواح میں ایک لاکھ پچیس ہزار نصرانی مجاہدین کا گروہ جو بسر کردگی سبیاستیو تاجدار پرتگال مسلمانوں کو ملک مغرب سے ختم کرنے کی نیت سے باپ بیٹا۔ روح القدس کی قسمیں کھا کر نکلا تھا مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح مارا گیا کہ نصاریٰ کا ایک متنفس بھی اپنے گھر کو واپس نہ جا سکا۔ اس جنگ صلیبی یا نصرانی جہاد کا نشہ یورپ ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان کے پرتگالی شہر گوا میں بھی کتنے ہی غریب مسلمان نصرانی راہبوں کے حکم سے قتل کئے گئے۔ مغرب اقصیٰ میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ ابو عبد اللہ متوکل علی اللہ اور اس کے

چچا عبدالملک معتصم سلطان مغرب میں نقیض تھی بمتوکل نے پرتگال سے امداد طلب کی سیبا ستیو
نے اس خیال سے آمادگی ظاہر کی کہ متوکل کی امداد سے معتصم کو ختم کردے پھر اس کے
بعد متوکل کا کام تمام کرکے ملک پر خود قابض ہو جائے گا۔ نصرانی لشکر طنجہ پر اترا اور
العرائش تک زراعت کو پامال. عمارات کو مسمار. زن و مرد کو قتل و غارت کرتا پہنچ گیا تھا کہ
ادھر سے عبدالملک اللہ اکبر کہہ کر اُٹھا۔ دونوں لشکر قصر الکبیر کے قریب صف آرا ہوئے
عبدالملک مرض الموت میں مبتلا تھا لیکن نصرانی لشکر جب وادی مخازن کے پل سے
گذر گیا تو عبدالملک نے پل کو توپ سے اڑوا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا طائر روح بھی پرواز
کر گیا ہوشیار حاجب نے سانحہ جانگداز پوشیدہ رکھا اور تخت رواں کے پاس سے اسی طرح
احکام دیتا رہا کہ گویا عبدالملک زندہ تھا شام تک جنگ رہی اور سلخ ماہ جمادی الاول
یوم دوشنبہ ۹۸۶ھ کا چاند جب افق مغرب سے کھیت کر رہا تھا تو میدان مسلمانوں کے
ہاتھ آچکا تھا۔ نصاریٰ کا سارا لشکر کھیت ہو چکا تھا۔ عشا کی اذان فتح و نصرت کے شادیانے
لے کر فلک الافلاک تک جا پہنچی۔ سیبا ستیو کے خون سے اسلامی تلوار کو سرخرو ہونا تھا
چنانچہ اس کا سارا غرور۔ سارا عزم۔ ساری شوکت عربی ٹھوکر سے ٹھکرائی گئی۔ متوکل نقشۂ
جنگ بدلتا دیکھکر فرار ہوا لیکن وقت آچکا تھا اس لئے دریائے لوقوس عبور کرتے ہوئے
فنا فی الآب ہوا۔

یہ واقعہ ۲۰ جمادی الاول ۹۸۶ھ مطابق ۴ اگست ۱۵۷۸ء کا ہے کہ جب ہندوستان
میں اکبر اعظم اپنے دور حکومت کے تئیسویں سال تسخیر گجرات میں کامیاب و ناصر ہو کر دہلی
واپس جا رہا تھا۔

پرتگال کی شکست فاش پر یورپ کو عرصہ تک یقین نہ آیا اور مدت تک یہ عقیدہ رہا

کہ حضرت مسیح نے سیباستینو کو نرغہ سے نکال لیا ہے اور وہ عنقریب ملک میں آئیو الاہی۔اس جنگ عظیم کے بعد پرتگال نے تین لاکھ دینار سرخ علاوہ دیگر تحائف و نذرانہ کے بطور تاوان جنگ دیا۔ فرانس۔انگلستان۔اطالیہ۔ہالینڈ نے بھی اس کے بعد دوستی کی استدعا پیش کی۔

گنج شہیداں جامع مسجد کے قریب نہ تھا اور پوری موٹر میری سواری میں نہ تھی اس لئے دور ہی سے فاتحہ وسلام پڑھ کر آگے کو روانہ ہوا۔

بصرہ الحمرا

قصر الکبیر سے باہر نکلنے کے بعد شاید آدھ گھنٹہ میں ایک پہاڑی سلسلہ نظر پڑا جس کی گیروی مٹی اور گیروی چٹانوں پر بھوپال کے پہاڑوں کا دھوکہ ہوا معلوم ہوا کہ یہ جبل صرصر کا سلسلہ ہے اور اس کے پرے شہر بصرہ جسے سرخ مٹی اور سرخ پہاڑ کی وجہ سے بصرہ الحمرا بھی کہتے تھے کسی زمانہ میں آباد تھا لیکن اب شہر در کنار اُس کی فصیل کے آثار بھی نہیں نظر آتے ملبہ کے ڈھیر ہیں کہ جن پر گھاس اُگ آئی ہے۔آبادی مطلق نہیں۔

تاریخ میں درج ہے کہ اس شہر کو ابو الفتوح یوسف نے برغواطہ کے فاسق و فاجر صالح بن عیسٰی کو کہ جس نے دعویٰ نبوت کیا تھا شکست دیکر ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

قنیطرہ

یہ ایک چھوٹی فرانسیسی چھاؤنی ہے۔بندرگاہ بھی ہے قصبہ بھی ہے مگر ویران۔فوجی

اجتماع سے تھوڑی بہت رونق ہے۔ میری موٹر چھاونی میں رُکی۔ قصبہ جانے کا وقت نہ تھا۔ موٹر سے ہی جو کچھ دیکھ سکا وہ دیکھا۔

مہدیہ

قنیطرہ مجھے پسند نہ آیا کیونکہ مہدیہ کے لئے دل بے قرار تھا۔ چنانچہ میں وہاں سے اُس شہر کی طرف مضطربانہ بڑھا جسے بربری قبیلہ بنی افریں کی سکونت۔ حضرت عبدالمومن کی نسبت۔ یعقوب کی تعمیر سے فضیلت حاصل ہے۔ ذرا آگے بڑھا ہوں گا کہ اس کے سفید مکانات۔ بلند مگر شکستہ منارہ جات مساجد۔ سرسبز مرغزار نظر آنے لگے۔ موٹر جوں جوں قریب ہوتی جاتی تھی۔ دل کی تڑپ زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ پُرشوق نگاہیں مجاہدین اسلام کی خواب گاہ ڈھونڈھ رہی تھیں اور میں دوربین لگا کر شکستہ مکانات۔ متحرک جھونپڑے ویران حصار۔ زیر تعمیر بندرگاہ۔ مقابر بوسلہم۔ منارہ جامع مسجد۔ صحرائی کارک۔ لہلہاتے ہوئے کھیت۔ پُرپیچ دریائے سیبو کو دیکھتا جاتا تھا۔ موٹر کی حرکت سے جب دوربین اپنے ثقل سے ہٹ جاتی تھی تو بلدیہ کی بدنظمی۔ فرانسیسی تغافل اور اسلامی بدبختی پر سرد آہ بھرتا کہ افسوس وہ شہر جو زمانہ سلف میں اپنی آبادی و رونق کے باعث "معمورہ" کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا اسے سلطان سعید الوطاسی کی خانہ جنگی نے اس قدر تباہ و برباد کر دیا کہ لوگ "مہدومہ" کہنے لگے۔ اس کی عظمت و جبروت کا حال بحر اٹلانٹک کی موجوں سے پوچھو جنھوں نے ایک عظیم الشان پرتگالی بیڑہ اور کثیر التعداد پرتگالی فوج کو ۱۵۱۵ء میں عربی سیف سے غرق فنا ہوتے دیکھا۔ اسی ساحل نے العیاشی سلوی اور اس کے مجاہدین کے جوہر شجاعت پر آفریں کی ہوگی جس کی ایک قلیل جماعت نے نصاریٰ اسپانیہ اور نیز اُس

انگریز کشور کشا ...... کو جس نے اس نواح میں بحری تاخت و تاراج شروع کر دی تھی کتنی زکیں دیں۔ انگریز گرفتار ہوا اور اس کی غارت گری ختم ہو گئی ورنہ زندہ و کامیاب رہتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں انگریزی نو آبادی نہ قائم ہو گئی تھی۔ اسی شہر میں مولائی اسمٰعیل فاتح طنجہ نے ۱۶۸۱ء میں اسبانیہ کی بھی خوب مرمت کی تھی

لیکن اب فرانس کی حکومت سارے ملک پر ہے۔ شہر میں دھول اڑ رہی ہے۔ افلاس و نکبت کی بلا میں سارا شہر مبتلا ہے۔ جامع مسجد ویران پڑی ہے۔ دار الصنعتہ اسلامی کو جہاں اسلامی بیڑہ طیار ہوتا تھا اب فرانس از سر نو مرمت کر رہا ہے مگر کس کے لئے اسلامی جہازات کے لئے نہیں بلکہ فرانسیسی جہازات کے لئے۔ عربی تجارت و صنعت کے لئے نہیں بلکہ فرانسیسی تجارت کے تحفظ و ترقی کے لئے۔

میں مہدیہ میں چند گھنٹہ سے زائد نہ ٹھیر سکا لیکن جتنی دیر رہا برابر چلتا پھرتا رہا اور بجز ایک قہوہ خانہ کے کہ جہاں کھانے کے لئے بیٹھ گیا اور کسی جگہ آرام نہیں کیا مہدیہ میں ایک مدرسہ بھی دیکھا جو مثل مکتب تھا۔ تقریباً ۳۰، ۳۵ بچے ابتدائی عربی کتابیں اور کلام مجید چٹائی پر بیٹھے پڑھ رہے تھے۔

اس نام کا ایک اور شہر ملک تونس میں بھی ہے جس کو میں نے سیاحت تونس کے سلسلہ میں دیکھا تھا۔

Rabat

رباط الفتح

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل
بسقط اللوی بین الدخول فحومل

(اے میری دوستو ذرا ٹھیر جاؤ کہ اپنی حبیب اور اسکی فرودگاہ کی یاد میں جو ریت کے ٹیلے کی پری مابین مواضع دخول و حومل واقع ہے سب ملکر رو دیں)

قنیطرہ سے میری موٹر دامن معمورہ کو کترتی ہوئی چلی۔ داہنی طرف سے بحر اعظم کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور بائیں جانب مرغزار معمورہ کا سبز مخملی فرش دلکش مگر دردناک نظارہ پیش کر رہا تھا کہ جدھر نظر اٹھاؤ بجز سبزہ زار اور جنگل کی آبادی نظر نہ پڑتی تھی۔ اگر کہیں کوئی بھولا بھٹکا انسان نظر پڑا تو وہ گلہ بان نکلا یا مزدور۔ میرے پاس ایک فرانسیسی پولیس افسر کی نشست تھی جو پہلے تو خاموش رہا لیکن جب نقشہ ملک مغرب میں نے کھولا تو ہم کلام ہوا اور یہ معلوم کر کے کہ میں ہندوستانی ہوں اور اس وقت انگلستان سے آ رہا ہوں ذرا دیر کے لئے متجسس ہو گیا کہ کہیں خفیہ سازش کے لئے تو نہیں آیا ہوں۔ فرانسیسی افسر تاریخ میں کورا تھا لیکن ملکی جغرافیہ اور سیاست میں اس کی معلومات لامحدود تھی۔ تمام ملک کا نقشہ حفظ تھا۔ راستہ میں جو پڑاؤ ملتا یا کوئی موٹر پاس سے گذرتی تو اسکے نام ونشان اور سیاسی روزنامچہ کی رپورٹ سنانے لگتا۔

رباط یہاں سے تقریباً ۲۶-۲۷ میل ہے۔ راستہ صاف اور ہموار ہے۔ اور پولیس افسر کی گفتگو میں یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ ایک گھنٹہ کب ختم ہوا۔ رباط بہت نشیب میں واقع ہے اس لئے جب تک ہم قریب نہ پہنچ لئے شہر نہ دکھائی دیا۔

سب سے پہلے سلا پڑا جس کے باب الفاس پر ہمارا کارواں رکا۔ میں اس شہر کی زیارت کے لئے بیقرار تھا اور بے اختیار رُکنے کو جی چاہتا تھا لیکن موٹر رباط تک کے لئے کر چکا تھا اور یہاں اُترنے میں نقصان ہی نقصان تھا خیر دوربین ہی سے نظارہ بازی شروع کی اور جہاں تک جرمن شیشون نے امداد کی۔ میری پُر شوق نظریں مجاہدین اسلام کی پابوسی کر آئیں۔ میں نے موٹر سے قدم نکالنا چاہا لیکن ڈرائیور نے منع کیا کہ کارواں ابھی چلنا ہے۔ چنانچہ سلا کی حسرت دیدار لے کر ہم آگے بڑھے

میں کھڑکی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دل بانسوں اچھل رہا تھا کہ سب سے پہلے میری ہی نظر مینارہ حسّن کی بلائیں لے اور اس شہر کی ارض پاک پر جو فتح فحص الجدید کی یادگار میں تعمیر کیا گیا ہو سب سے پہلے مجھی کو خاک بوسی کا شرف حاصل ہو کاروان قنیطرہ بورج رج عبور کر کے دامن قلعہ رباط کا طواف کر رہا ہے .... مدینہ بالکل نظر نہیں آتا ....

ایک منٹ گذرا .... دو منٹ گذرے .... تین منٹ بھی ختم ہوگئے .... یا اللہ رباط کتنی دور ہے .... نزدیک پہنچکر اس قدر بُعد۔ دھلیز پر آنکر اس قدر فصل! .... اب موٹر ایک آخری بل کھا کر ذرا بلندی پر چڑھی اور میری نگاہیں جامع الفتح کی ماذنہ پر جو آہ نارسا کی طرح تکمیل ہوتے ہوتے رہ گیا لوٹنے لگتی ہیں۔ اس کی شان و شکوہ۔ اس کا ارتفاع اس کی کس مپرسی اور حسرت ناک ویرانی دیکھکر میں دم بخود ہوں۔ کاش موٹر یہیں رُک جاتی اور میں اسکے سایہ کے نیچے بیٹھکر دل ٹھنڈا کر لیتا لیکن کاروانی سیّارہ پر اور مسافر بھی سوار ہیں .... موٹر نے ایک اور چکر کاٹا .... اے لو منارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا .... ایک نئی سڑک پر جو فرانسیسی امیر العساکر زافرے کے نام سے منسوب ہے موٹر رواں دواں ہے .... چپ و راست غریب اہل رباط حلقہ بہ حلقہ کھڑے ہیں۔ ان کے پژمردہ چہروں سے افلاس و نکبت۔ بےروزگاری و پریشان حالی عیاں ہے۔ وہ ہر موٹر سوار کو دیکھتے ہیں اور غالباً اس کے تعیش اور دولت و ثروت کو اپنے افلاس سے مقابلہ کر کے روتے ہیں۔ کاروان نے باب الحد پر دم لیا قلیوں کا ہجوم ہو گیا۔ میں نے سامان ایک بگھی میں رکھوا کر باب العلو کی راہ لی اور ہوٹل اطلانتک کی دوسری منزل کے بیسویں کمرہ میں جا کر ایک کرسی پر گر گیا۔ تصور نے مرابطی اور موحدی غزوات کا نقشہ کھینچنا شروع کیا کیا اسی ساحل بورج رج پر مجاہدین کا اجتماع ہوا ہو گا۔ کیا

یہ وہ میدان نہیں ہے۔ جہاں اذفنش کی سرکوبی کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ کیا یہ نیم مُردہ نحیف وناتواں انبوہ جو دروازہ کے سامنے ہر یورپی موٹر سوار کو جماہی لے کر نگاہ بیم ورجا سے گھورتا رہتا ہے ان غازیوں کا نام لیوا ہے جنھوں نے ہزارہا یورپی اسیران جنگ سے یہ میدان بھر دیا تھا۔ یہ فراش جس کی دست وبازو اس وقت ایک ہندی سیاح کا سامان کھول رہے ہیں کبھی کشور کشا تھے اور آج اجنبی سیادت اگر اٹھ جائے تو تیغ وتفنگ سنبھالنے لگیں۔ حسن رباطی نہیں ہے بلکہ فاس کے تاریخی محلہ شعبانیہ کا باشندہ ہے۔ وہی شعبانیہ جہاں ۴۰ ہزار اسبانوی اسیران جنگ نے باوجودیکہ منصور نے حسب وعدہ سب کو ماہ شعبان المکرم میں آزاد کر کے طلیطلہ واپس جانے کی اجازت دیدی تھی مشرف باسلام ہو کر دوامی سکونت اختیار کر لی تھی۔

بنائے رباط الفتح اور زوال سلطنت مغرب اقصیٰ کا منظر

منظر ۱ (بنا)

مقام:۔ ساحل بورج رج

زمانہ:۔ ۱۱۹۴ء

ساحل بورج رج پر ایک عظیم الشان پڑاؤ ”العموم“ اور ”المجموع“ کا پڑا ہوا ہے قافلہ پر قافلہ چلا آرہا ہے۔ ہر مجاہد کے سر پر سفید عمامہ کا ڈھاٹا بندھا ہے۔ دُوہرے ڈھیلے کرتہ کے سوا اور کوئی امتیازی وردی نہیں ہے۔ ان کے کشادہ سینے مضبوط دست وبازو گُتھے ہوئے بدن اُن کی سادہ اور پاک معاشرت کے شاہد ہیں۔ ہاتھ میں طولانی نیزہ کاندھے پر کمان۔ کمر میں خنجر اور پالان میں ترکش پڑا ہوا ہے۔ نیا قافلہ فرودگاہ کے قریب

پہنچکر تکبیر بلند کرتا ہے جس کے جواب میں اس دل بادل انبوہ سے بیک زبان اس جوش و خروش سے نعرہ بلند ہوتا ہے کہ سارا میدان دہل جاتا ہے۔

منظر ۲ (عروج)

مقام:۔ ساحل بو رج رج۔

زمانہ:۔ ۱۱۹۵ء

جنگ محض الجدید (ارک ۔اسپین) سے لشکر ظفر پیکر واپس آرہا ہے۔ جلو میں ۴۰ ہزار اسیران جنگ ایک لاکھ خچر، اسی ہزار گھوڑے، چار لاکھ گدھے، ساٹھ ہزار زرہ، پچاس ہزار چھولداریوں کا مال غنیمت ہے۔ شکرانہ فتح میں جامع اشبیلیہ کا منارہ اسپین میں اور مراکش کی جامع کتبیہ کا ماذنہ مکمل ہو رہا ہے۔ شہر رباط کی بنیاد پڑ رہی ہے اور نصرت و کامیابی کی یاد میں رباط الفتح نام رکھا جا رہا ہے۔

منظر ۳ (زوال)

مقام:۔ بندرگاہ دارالبیضا

زمانہ:۔ ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء

تعمیر بندرگاہ کا ٹھیکہ ایک فرانسیسی ٹھیکہ دار حاصل کرتا ہے۔ ایک نصرانی مزدور ایک اسلامی قبر کی بے حرمتی کرتا ہے۔ عرب مزدور منع کرتا ہے۔ فرانسیسی نشہ حکومت میں کچھ نہیں سنتا اور گالی دیتا ہے۔ سخت کلامی شروع ہوتی ہے۔ عرب فرانسیسی کو پچھاڑ کر زمین پر دے مارتا ہے۔ دیگر فرانسیسی امداد کو پہنچ جاتے ہیں جو دست بدست کی جنگ میں مغلوب

ہو جاتے ہیں۔ آخر فرانسیسی طپنچہ داغتا ہے نہتا عرب پتھر اٹھاتا ہے۔ کئی درجن مسلمان جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ فرانسیسی مجروحین کی تعداد نو سے زائد نہیں پہنچتی جس میں تین اطالوی اور تین اسپانوی مزدور تھے لیکن فرانسیسی مزدوروں کا طیش انتقام کم نہیں ہوتا۔ ٹھیکیدار جمہوریہ فرانس کی دہائی دیتا ہے۔ کے دارسی (مستقر صیغہ خارجیہ فرانس) گولہ باری کا حکم دیتا ہے غریب عرب سلطان کو پکارتے ہیں لیکن وہاں صم بکم عمی فہم لا یرجعون کا وظیفہ جاری ہے فرانس رباط کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اور سارے شہر کی آبادی کو بلا لحاظ عمر تہ تیغ کر کے خون کی ندیوں میں اپنی فوج کو عبور کر کے ایک ٹھیکیدار کے انتقام میں صوبجات دکالہ۔ عبدہ شیاذمہ۔ حاحہ۔ بلاد احمر۔ تادلہ پر دوامی تسلط حاصل کر لیتا ہے۔

منظر ۲ (انفصال)

مقام:۔ فرانس

زمانہ:۔ ۱۹۱۴-۱۹ء

جرمنی فرانس پر حملہ کرتا ہے۔ فرانس حالت نزع میں سلاطین عالم کا واسطہ دیتا ہے مغرب اقصیٰ سے عساکر اسلامیہ جوق جوق فرانس پہنچکر جرمن تیغ و تفنگ کا نشانہ بنتے ہیں۔ معشوقہ فرانس انداز دلربائی سے مساوات۔ حریت۔ عدالت کے دھوکہ بقول جگر ؎

مجھے دیرہی ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے ۔۔۔ کبھی آکے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے

تقریر و تحریر۔ اخبارات۔ مراسلات سے دیتی ہے لیکن بعد صلح جب ایفا کا وقت آتا ہے تو "مغربی دُنبہ" فرانسیسی چھری سے حلال کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی رزیڈنٹ (حاکم) اور ممالک الملک (محکوم) ہو جاتا ہے۔

منظر ۵ (خاتمہ)

مقام:- جامع دار المخزن رباط الفتح

زمانہ:- ۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء یوم جمعہ

جمعہ کا دن ہے۔ راقم الحروف محل سلطانی کی مسجد کے پاس چند فرانسیسی سیاحان کے ساتھ "امیر المومنین خلیفۃ المسلمین سلطان مولائی محمد" کا جلوس مشاہدہ کر رہا ہے ......

....

....

.... دیکھنا وہ بخاری

دستہ سرخ ترکی ٹوپی دئے نیلگوں کوٹ اور گھاگرہ دار پائجامہ پہنے آرہا ہے سب کے کانوں میں پیتل کی بالیاں پڑی ہیں۔ سب کے سب سیہ فام۔ تنومند۔ قوی ہیکل۔ بلند و بالا ہیں لیکن چال ڈھال سے نہ بربری عزم ہویدا ہے اور نہ سودائی جوش ملت عیاں ہے .... فوج مسجد تک صف بستہ ہوگئی ہے .... ذرا سننا .... نفیری و شہنائی کی آواز آرہی ہے .... وہ دیکھو کوکب ہمایوں نکلا .... ایک بگھی رینگتی ہوئی آرہی ہے۔ چپ و راست دو حبشی خدام مگس رانی کر رہے ہیں۔ مورچھل سے نہیں بلکہ سفید ریشمی رومالوں سے۔ بگھی کے پیچھے وزرا ٹٹوؤں اور خچروں پر سوار ہیں .... آن واحد میں سواری قریب آتی ہے ....

سلطان ہماری طرف دیکھتا ہے۔ یورپی خواتین دلربایانہ تبسم اور جنبش ساعد سیمین سے خیر مقدم کرتی ہیں۔ سلطان خندہ پیشانی سے اعتراف کرتا ہے۔ میں اکیلا دم بخود ہوں۔ سلام کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ہاتھ مفلوج ہو چکے تھے دعا دینا چاہتا ہوں مگر زبان گنگ ہو چکی تھی سر تسلیم خم کرنا چاہا مگر گردن نے انحراف کیا۔ غیرت قومی نے ڈانٹا کہ اس مضغہ گوشت

ننگ اسلام۔ ملک فروش ہستی کی تعظیم کیسی ؟ یہ ایک گدّا ہے جسے فرانسیسی استبداد نچاتا پھرتا ہے
ایک لاش ہے کہ کفنا کر بگھی میں بٹھا دی گئی ہے اور وقت ضرورت نکال لی جاتی ہے......
......بگھی مسجد کے پاس رکتی ہے۔ پھاٹک کھلتا ہے۔ ایک ملفوف شکل برآمد ہوتی ہے۔
مسجد میں قدم رکھتی ہے......پیچھے پیچھے اعیان سلطنت کا ہٹر بونگ ہے......
مجھے سب سے آخر میں اندر جانا نصیب ہوتا ہے اور جگہ بھی ایک کونہ میں بمشکل ملتی ہے......
سنتیں پڑھنے کا وقت نہیں۔ خطبہ وفرض کے چند منٹ بعد یہ جلوس یا جنازہ مسجد سے نکلتا ہے
اور آہستہ آہستہ قصر سلطانی جسے "محبس" کہنا زیادہ موزوں ہوگا رینگتا ہے......
......اور میں مغربی
کٹ پتلی کا آخری تماشہ رباط الفتیح میں نہیں بلکہ "رباط المفتوح" میں دیکھکر باحسرت ویاس
رخصت ہوتا ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

باب ؤدایا کھانا کھانے کے بعد جب میں... ایک دلیل کے ہمراہ اس نیم ویران۔ خاموش
وسوگوار پھاٹک کو دیکھنے چلا جو ساحل بورج رج اور بحر اطلانتک کے اتصال پر اپنی رنگین
گلکاری۔ خوشنما محراب سنگین مینار۔ کمانیدار چھت اور سبک غلام گردش سے مرجع سیاحان
عالم بنا ہوا ہے۔ تو پہلی نظر میں مرحوم قسطنطینہ کے باب عالی سے بھی کم دقیع اترا لیکن دلیل
کی داستان گوئی نے آگاہ کیا کہ یہ لاجواب وغیر معمولی محراب۔ یعقوب کا گھر وندا موحدی
شجاعت وتہور کی یادگار۔ سلاوی شمشیر سازی کا دار الصنعت۔ بربری سرفروشی کی بازیگاہ
غزوات اندلس کا دیباچہ یعنی جیوش ؤدایا کے معسکر ودار القیامہ (قصبہ) کا باب ہے۔ میں
چونکا سنبھلا۔ بیاض جیب سے نکالی اور جو یادداشت پہلے سے لکھ رکھی تھی اس سے حافظہ کو
تازہ کیا۔ خوشا نصیب کہ بخت یاور نے آج موحدی کلمہ گویاں کی سجدہ گاہ فاتحان فحص الجدید

کی کاروانسرائے تاراج کنندگان الخالدات ابن طفیل کی درسگاہ پر پہنچا دیا۔ دل میں جوش اٹھا جو اُبل کر آنکھوں کی راہ قطرہائے اشک کی شکل میں منقلب ہو گیا۔ طبیعت بے کیف ہونے لگی قدم قدم پر سجدہ کے لئے پیشانی تڑپنے لگی۔ ہر ذرّہ میں کسی قدسی صفت کی جھلک تاباں اور ہر تودہ خاک میں ناموران ماضی کا نور درخشاں پانے لگا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں فتح اندلس کے لئے قافلہ جمع ہوا تھا۔ اسی جگہ قبائل دُکالہ۔ حاحہ صنہاجہ کو صہبائے وحدت نے سرشار کیا تھا۔ اسی زمین کو تینمل کے زہاد و عباد کے سجدہ سے شرف حاصل ہوا ہے۔ اسی جگہ بحر اطلانتک نعرہ توحید سے پر شور اور آب بورج رج موحدوں کی قدمبوسی سے مفتخر ہوا۔ اس وقت اس کی ریتیلے تودہ۔ ناہموار زمین۔ ویران منظر پر نہ جاؤ۔ آج تباہ حال ہے تو کیا ہوا کل یہ معمورۂ عالم تھا۔ سلاطین قسطالیہ کے عرائض اسی محراب کے نیچے پیش ہوا کرتے تھے۔ سفرائے ادفنش اسی "السطین المحمر" پر جبہ سائی کیا کرتے تھے۔ یہی وہ بندرگاہ ہے جہاں سواحل انگلستان و ہالینڈ و ناروے پر تاخت و تاراج کے منصوبے کئے جاتے تھے۔ فتح سوڈان و افریقہ کی داغ بیل اسی چٹان پر پڑی تھی اور انگریزی۔ فرانسیسی۔ مالٹی۔ اطالوی۔ ڈچ جہازات گرفتار کرنے کے لئے سلاوی رضا کاران کا نعرہ سب سے پہلے اسی ٹیکرہ سے گونجا تھا۔ کیا کوئی مردہ دل ایسا ہے جو ان واقعات کا تصور کر کے خاقانی کی ہمنوائی سے اجتناب کریگا۔

ایں ہست ہماں ایواں کز نقش رخ مردم | خاک در او بودے دیوار نگارستان
ایں ہست ہماں درگہ کو را ز شہاں بودے | دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستان

دیکھنے کو تو یہ ایک معمولی سرخ پھاٹک ہے جو نقارخانہ جات دہلی و آگرہ سے بھی چھوٹا ہے لیکن کسی چیز کی عظمت جسامت اور تن و توش سے نہیں ہوا کرتی۔ انگلستان کا

تخت تاجپوشی کیا ہے؟ ایک بھدی۔ دہقانی چوبی کرسی جو کہ جشن کے وقت بھی توشک وگدہ سے محروم رکھی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیر کرسی کے سامنے ایک تخت طاؤس کیا بیسوں تاج شرماتے ہیں۔ وزیر مالیہ انگلستان جب سالانہ میزانیہ حکومت دارالعوام میں پیش کرتا ہے تو ایک پورانے۔ نیم شکستہ بد وضع صندوقچہ پر ہاتھ رکھکر تقریر کرتا ہے کہ شاہان سلف کی یادگار ہے۔ باب قصبہ ودایا جس کے سرخ داسہ اور گارہ میں سات سو سال کی تاریخ بھری ہے۔ ہرچہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر کی تفسیر بنا ہوا ہے لیکن زمانہ بدل گیا۔ زمین بدل گئی۔ آسمان بدل گیا۔ شتربان بدل گئے۔ جوشن وسنان بدل گئے۔ موحدوں کی تکبیر بند ہوگئی۔ مریئین کا درس ختم ہوگیا۔ سعدیئین کی اولوالعزمی قصہ کہانی ہوگئی۔ ریل وغبارہ کا دور دورہ ہوگیا۔ کلدار توپ اور زہریلی گیس کی حکومت ایجاد ہوگئی۔ دستار وکلاہ کی جگہ ہیٹ نے لے لی۔ اللہ اکبر کی جگہ نای ونوش ہے۔ علوی ادبار نے غیر قوم کو سرپرست بنالیا۔ عرب کا خاتمہ اور فرانس کا بول بالا ہو چلا ہے۔

نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے نہ فدائے مست الست رہے
وہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے

جنتہ الاندلس باب ودایا سے چلتے وقت جب اپنی بیاض کے ایک کونہ میں یہ یادداشت لکھی ہوئی دیکھی (جنتہ الاندلس متصل باب ودایا) تو شوق اندلس تازہ ہوگیا۔ دل نے کہا کہ پھولوں کے تختہ کے پاس بیٹھنا چاہیئے۔ گذشتہ اسلامی عظمت وجلال کے خواب دیکھکر دل کی حسرت نکالنا چاہیئے۔ لیکن چند منٹ بعد جب ایک پھلواری کے اندر داخل ہوا تو قدم رکھتے ہی کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ پھلواری کی روشیں بیشک اضلاع اقلیدس کی طرح باقاعدہ بنی ہوئی ہیں لیکن نہ کہیں گلاب کا تختہ بھرا ہوا تھا اور نہ گل فرنگ۔ نہ سنبل یا یاسمین کی لپٹ

کہیں سے آرہی تھی اور نہ نرگس و لالہ کا کہیں پتہ تھا۔ انار کے درخت ضرور تھے لیکن بےثمر
زیتون اور انجیر کی جھاڑی سے پھلواری جنگل معلوم ہوتی تھی۔ پھول برائے نام تھے اور جو
تھے وہ یورپی۔ دوب بڑھی ہوئی تھی اور کھاد اور مٹی کی کمی سے جا بجا گنجی ہو چلی تھی۔ روشوں
کے حاشیہ عرصہ سے نہیں تراشے گئے تھے۔ یہ حالت دیکھکر افسوس آیا کہ مسلمانان اندلس
کی تحقیر و تذلیل اس طرح کیوں جائز رکھی گئی ہے۔ اگر اندلسی چمن سے مراد صرف چند اشجار
کھجور و نارنج سے ہے تو خدا کے واسطے اس پھلواری کو مٹا دو۔ ایسے وحشت خیز باغات
اور ویران پھلواری کی سیر سے میں باز آیا۔ اس سے تو کہیں بہتر و شاداب و پُر بہار پھلوار
شارع پتی ژے اور شارع شلہ کی ہر دو جانب لگی ہوئی ہے اور زار دبن ای سے واقع
باب التمر کا تو کیا کہنا کہ جنت کا ایک تختہ معلوم ہوتا ہے۔ فرانسیسی رزیڈنسی کے خوش رنگ
شاداب تختے تو پھولوں کے بوجھ سے زمین پر بچھے پڑے ہیں لیکن یورپ تو شیخ سعدی
کے مقولہ نام نیکو رفتگان ضائع مکن پر کبھی کاربند ہوا ہی نہیں۔ یونان ہمیشہ شامی و مصری
تہذیب کو مٹاتا ہی رہا اور رومہ نے تو اپنے دشمن کے نام و نشان مٹانے میں کوئی دقیقہ
اٹھا نہ رکھا۔ اس نے اپنی مجالس میں کوسنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ جب تک قرطاجنہ
کی اینٹ سے اینٹ نہ بجالی اور اس کی ایک ایک چوکھٹ۔ کھڑکی۔ میال کو جلا کر خاک
سیاہ نہ کر ڈالا چین نہ آیا۔ پھر فرانس آخر یورپ ہی کا تو بچہ ہے۔ اس سے شکایت فضول
ہے۔ غرضکہ دس پندرہ منٹ کی نظارہ بازی اور دو تین روشوں پر چہل قدمی کے بعد مجھ
پژمردہ دل کے قدم آگے کو اٹھ نہ سکے ؎

اُردئ عیشم خزاں شد۔ وین عجب کاندر میاں
لالہ می روید مدام از نرگس شہلائے من

ماذنہ حسن | قصبہ ودایا سے نکلکر میں نے ماذنہ حسن کا رخ کیا۔ اگرچہ راستہ میں ساحل کے قریب اس فصیل پر بھی ٹھیرنا چاہتا تھا جس کی تعمیر میں مسلمانان اندلس نے عملی امداد کا ثبوت دیا تھا لیکن شوق۔ یادگار فحص الجدید کے سوا کسی اور طرف دیکھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ دیّل صاحب راستہ کی عمارات۔ مساجد وغیرہ بتلائے جاتے تھے لیکن مجھے سب سے بے رخی تھی۔ آخر موٹر ناگ پھنی کے ایک باڑہ کے پاس رُکی۔ دیّل نے دروازہ کھولا اور میں تقریباً دو بیگہ کی ویران وناہموار مسافت طے کر کے اس حسین ولاجواب منارہ کے نیچے پہنچ گیا جس کی تصویر سالہا سال سے دماغ میں چکر لگا رہی تھی۔ اللہ اللہ کیسا خوشنما ماذنہ ہے کہ نظر ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کی مربع ساخت۔ بیرونی نقش ونگار۔ مستحکم بنیاد۔ جالیدار کام کس قدر موزوں ہیں۔ حسرت ہے تو یہی کہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور صرف ۱۶۵ فٹ جا کر رہ گیا (تاج گنج کا منارہ ۱۳۱ فٹ اور جامع مسجد دہلی کا منارہ ۱۳۰ فٹ بلند ہے) ورنہ دنیا کا اعظم ترین منارہ آج رباط الفتح میں ہی ہوتا لیکن پھر بھی اپنی ادھوری نامکمل حالت میں اس قدر پُر شکوہ ہے کہ ہر سیاح خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہے۔ اوپر چڑھنے کے لئے سلامی نما رپٹے ۵ ½ گز چوڑے بنے ہوئے ہیں جس سے گھوڑا اوپر تک جا سکتا ہے۔

یہ منارہ جامع الفتح کے لئے ۵۹۲ھ میں تعمیر ہوا تھا لیکن نہ منارہ مکمل ہو سکا اور نہ مسجد (قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام دہلی اس سے ۳۴ سال بعد میں تعمیر ہوئی) قطب مینار ماذنہ اشبیلیہ سے چھوٹا ہے۔ لیکن مسجد قوۃ الاسلام بلحاظ وسعت۔ نامکمل مسجد جامع الفتح سے بڑی ہے یعنی مسجد قوۃ الاسلام کچھ اوپر دوسو گز لانبی ہے اور مسجد جامع الفتح صرف پونے دوسو گز عریض ہے۔ مسجد کا سامان ادھر اُدھر پڑا ہوا ہے اور اس وقت بھی ۳۶۰ عمدہ شفاف ستون غلام گردش کے پڑے ہوئے ہیں۔

سجن میرے پروگرام میں معائنہ محبس رباط نہ تھا لیکن ہوٹل کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے ایک روز جب چند فرانسیسی سیاح وہاں جانے لگے تو میں بھی مہتمم ہوٹل کی صلاح پر یہ خیال کر کے کہ ریاست بھوپال کے محابس میرے ہی صیغہ کی ماتحتی میں ہیں شریک پارٹی ہو گیا اور تقریباً ایک گھنٹہ صرف کر کے واپس آ گیا۔ اسکا مقابلہ ہندوستان کے سر برآوردہ محابس کلکتہ و بمبئی سے کرنا بیکار ہے لیکن یہ عرض کرنا بھی مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے کہ مجموعی طور سے بھوپال کا جیل خانہ رباط کے محبس سے کم نہیں ہے اور فرش۔ لباس۔ بستر۔ خوراک محنت۔ صحت۔ صنعت و دستکاری کے مقابلہ میں بھوپالی قید خانہ منشی فخرالدین صاحب جیلر کے حسن انتظام اور محنت و کاوش سے در اصل "سرکاری مہمان خانہ" بن گیا ہے۔ رباط کی محبس میں وہی معمولی کام ہوتے ہیں جو دیگر چھوٹے جیل خانوں میں ہوتے ہیں۔ مثلاً قالین موٹا کپڑا۔ چٹائی۔ جوتہ وغیرہ بنانا۔ رباط کی جیل میں سونے کے لئے اونچے سیمنٹ کے چبوتری نہیں ہیں۔ کھانے میں کُس کُس اور شوربا بلا بوٹی کے ملتا ہے۔ قہوہ بھی جو مغربی طعام کا جزو بن گیا ہے دیا جاتا ہے۔ نماز اور تعلیم کا انتظام بھی بھوپال سے بہتر نہیں ہے۔ سنگین مجرموں کی گردن میں طوق پڑا رہتا ہے اور بھاری بیڑیوں سے تو کوئی مستثنیٰ نہیں۔

یہ محبس کسی زمانہ میں فوجی بارک (قشلہ) تھی جس کو بعد ترمیم جیل خانہ بنا لیا گیا۔

عجائب خانہ قصبہ ودایا میں ایک عمارت از نام مدرسہ ہے جہاں کسی زمانہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم ہوتی تھی لیکن مسلمانان اندلس کے اخراج پر فنون حرب کی تعلیم شروع کر دی گئی تھی۔ چنانچہ اسی درسگاہ کے نکلے ہوئے من چلے سپاہی ساحل یورپ پر تاخت و تاراج کیا کرتے تھے لیکن اب نہ تعلیم حدیث ہے اور نہ تعلیم حرب۔ اس وقت اس عمارت میں مقامی صنعت کے نمونے (قالین۔ اونی کپڑا) رکھے ہیں جو میری نظروں میں مطلق نہ جچے۔ البتہ

اس کے پاس ایک کوشک میں زمانہ حال کا تیار کردہ سامان جو رکھا ہوا ہے وہ مقابلتہً
اچھا اور نفیس ہے جس کی وجہ بظاہر پروپگنڈا معلوم ہوتا ہے کہ عہد ماضی کے مقابلہ
میں فرانسیسی سیادت کے زمانہ میں ملکی صنعت نے کس قدر ترقی کر لی ہے۔

شلہؔ یہ سلاطین مرینین کا قبرستان ہے جو رباط سے ۲۔۳ میل کے فاصلہ پر واقع
ہے۔ سڑک اچھی خاصی ہے لیکن احاطہ قبرستان تک نہیں جاتی۔ موٹر سے اُتر کر خراب پیچیدہ
اور نشیبی راستہ ملتا ہے جس پر مجھ جیسے تیز رفتار اور جلد باز کو قدم سنبھال سنبھال کر چلنا پڑا
پھاٹک کے اندر پہنچکر "دیار رہے او سر یار رہے گو جر" کا مقولہ یاد آجاتا ہے۔ ہر چہار طرف
سناٹا طاری ہے۔ آبادی میں صرف دو گھر مجاوروں کے دکھلائی دیئے۔ ایک پُرانا درخت
نارنگی کا خوب لدا ہوا تھا لیکن معلوم ہوا کہ جو نارنگی زمین پر گر جاتی ہے وہی فروخت کی
جاتی ہے۔ بلدیہ نے درخت سے نارنگی توڑنے کی ممانعت کر دی ہے۔ شلہؔ کے آس پاس
کھیتی ہو رہی ہے اور میرے زمانہ میں جوار خوب بڑھی ہوئی تھی۔

یہاں بجز مقابر بنی مرینین کے اور کوئی چیز قابل دید نہیں ہے۔ سب میں خوبصورت لیکن
حسرت ناک قبر ابوالحسن الاسود دہمین فرمانروائی ہے جس نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے
کلام مجید بیت اللہ شریف روضہ متورہ اور بیت المقدس میں رکھوائے تھے۔ اور جو ۲۷؍
ربیع الاول ۷۵۲ھ کو عالم جاودانی کو رخصت ہوا اور اول جبل اطلس میں سپرد خاک ہوا
زاں بعد یہاں خاک میں ملایا گیا۔ اس کی محبوب ملکہ شمس الضحٰی بھی چہارم رجب ۷۵۰ھ سے
چادر خاک اوڑھ کر سو رہی ہے۔ یوسف الناصر چہارمین فرمانروا جس کی شہرت شہر منصورہ
(متصل تلمسان) کی تعمیر اور مجالس میلاد شریف کے اجرا سے عرصہ دراز تک قائم رہیگی
ایک خواجہ سرا کے ہتھ قبض سے شہید ہو کر یہیں سو رہا ہے لیکن اولین نعش جس نے

اس قطعہ آرضی کو عزت بخشی اسی فرمانروا کی ماں اُمہ العزیز ملکہ سلطان ابویوسف یعقوب تھی ۔ ابوثابت بھی جس نے طنجہ میں انتقال کیا تھا ۔ آسودہ خواب ہے ۔

سلا

Salé

خط موسومہ مسٹر رئیس احمد انڈر سکرٹری اسٹیٹ کونسل بھوپال

آج میں جامہ میں پھولا نہیں سماتا ہوں ۔ مسرت کی کوئی انتہا نہیں ۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی خوش قسمت نہیں ۔ ایک مدت مدید کے بعد بخت بیدار ہوا ۔ گردش فلک نے پلٹا کھایا ۔ دل کی مراد بر آئی روح وجد میں ہے ۔ دماغ رقصاں اور دل فرحاں وشاداں ہے کہ خداوند کون ومکان نے اپنے حبیبؐ کے صدقہ میں آج اس سرزمین پر پہنچا دیا ۔ جس کی قدمبوسی کے لئے کامل دس سال سے میں تڑپ رہا تھا یعنی شہر سلا واقعہ ساحل بورج رج کے ہوٹل پریزیڈین سے یہ چند سطور آں عزیز کو لکھ رہا ہوں ....

....

....

کون سلا ؟ وہی جس کے مجاہدین نے بحیرہ رومہ کو متھ ڈالا تھا جس کے تاخت وتاراج سے نہ انگلستان کے ساحل محفوظ رہ سکے ، اور نہ ہالینڈ وبلجیم کے بندرگاہ جس کے ایک زورق کے سامنے اطالیہ واسبانیہ کے بیڑے منتشر وپراگندہ ہو جاتے تھے جس کے نام سے یورپی مائیں بچوں کو ڈراتیں بوڑھے کوسنے دیتے اور نوجوان لرزہ براندام ہو جاتے تھے ۔ اسی ارض مقدس پر ایک ننگ قوم ۔ اسی دنگل پر ایک ننگ دل ہندی ۔ اسی برگزیدہ مدفن پر ایک ناکارہ اسی پرشکوہ کھنڈر پر ایک نوحہ خواں کھڑا ہو

بادش نسیم مشک سا آبش زلال جانفزا   خاکش بود کحل جلا در دیدۂ اہل عیاں

مبارک تھا وہ جس نے ایسا مرکز شجاعت قائم کیا ۔ تمیم زیری نے یوں تو ۴۰ سالہ

دورحکومت میں اپنا ڈنکہ تمام شمال افریقہ میں بجوالیا اور قیروان سے مالطہ اور صقلیہ تک کوئی حریف نہ تھا جس نے سر اطاعت خم نہ کیا ہو لیکن اے سلا! یہ صرف تیرے ہی شناوران کے حصہ میں تھا کہ بحر اطلانتک. خلیج بسکے. انگلش چینل بحر رومہ کو کھونڈ ڈالا. تیری عمارۃ بحری کے سامنے دول یورپ لرزاں تھے. وینس کا زہرہ آب تھا جنیوا اور تولون خائف تھے. جرمنی کے بندرگاہ برمین اور ہمبرگ تیری تاخت سے پناہ مانگتے تھے تاریخ شاہد ہے کہ تیرے ہی ملاحوں نے اسبانیہ کی دشمنی کی وجہ سے فوج کشی آرمڈا کی اطلاع دیکر انگلستان کو تباہی سے بچالیا. تیری ہی نبرد آزماؤں کی ایک جماعت نے ولیم سوئم کے خلاف جیمس کی امداد بوقت حملہ انگلستان کی تھی. تیرے ہی ملاح کولمبس کے رہنما تھے. اور تیرے ہی نوجوان فرانسیسی بیڑے کی ناخدائی کرتے تھے. عبدالرحمٰن برغاشی کی مار آسٹریا کو اب تک یاد ہے. جزیرہ واٹ کو تیری گولہ باری ابھی فراموش نہیں ہوئی. مگر فرانس ۱۸۶۰ء کی ہزیمت کا بدلہ اب لے رہا ہی

آں عزیز چونکہ میری طبیعت اور مذاق سے واقف ہیں اس لئے آنعزیز کو تو نہیں لیکن دیگر پرسان حال کو یہ سن کر غالباً استعجاب ہوگا کہ سلا میں پہنچکر سب سے پہلے جس مقام کی طرف میں نے رخ کیا وہ آبادی سے دور آسودگان خواب کی خاموش بستی تھی اور میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی ناہموار و پیچدار پگ ڈنڈیاں شکستہ ڈھیر. گمنام و فراموش کردہ آرام گاہوں کی زیارت میں مجھ کو کس قدر روحانی لذت ملی. اگرچہ بیشتر قبور مسلمانوں کی تغافل ولاپروائی سے ٹوٹ چکی ہیں. شاذ و نادر ہی ایسے مرقد تھے جن پر کوئی لوح یا تعویذ محفوظ ہو کتبے تو اور بھی کم ہیں اور جو ہیں وہ پڑھے نہیں جاتے لیکن ان سب کے باوجود اس خرابہ نے مجھ کو ایک گھنٹہ تک باہر نکلنے نہ دیا. بیشک مجھ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہمارا رہبر گاودی تھا. تاریخ وجغرافیہ سے کورا اور علم الرجال سے بے بہرہ ہونے کے علاوہ اس

قبرستان میں شاید ہی کبھی آیا ہوگا۔ اس لئے حملہ آوران انگلستان وہالینڈ۔ فرانس و ناروے کے نشان بتلانا در کنار ان کے نام سے بھی بے خبر تھا اس لئے وہ دم بخود کھڑا رہا۔ ہاں جس طرف میں جاتا تھا ادھر کا راستہ جھاڑی جھنکار سے صاف کرتا جاتا تھا اور عجب نہیں جو میری مجنونانہ حرکت اور آبلہ پائی پر دل میں ہنستا ہو لیکن میں نے بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک قبرستان مانجھ کر دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جذبہ دل کہتا تھا کہ یہ عبدالرحمٰن کی خواب گاہ ہے۔ اس ڈھیر میں جو برج الکبیر کے قریب ہی احمد بن عیسیٰ غماری محوخواب ہے۔ باب شعت کے پاس اُس شاخ یاسمین کے نیچے وہ نوجوان مجاہد ہوگا جس پر ہالینڈ کی امیر زادی عاشق ہو گئی تھی۔ اس چادر خاک کی تہ میں کیا عجب جو ونیس پر یورش کرنے والا لیٹا ہو۔ اس ملبہ کے نیچے برسٹل پر تاخت کرنیوالا اور اس کے پاس جزیرہ وائٹ کا غازی فردائے قیامت کے انتظار میں غافل پڑا ہے۔ حضرت بن عشیر کے روضۂ مبارک کے پاس جو تربت ہے اس میں امریکانی جہاز کا گرفتار کنندہ سو رہا ہے ؎

اس میں مجنوں ہے اور اس میں کوہ کن | عاشقانِ ناز تھے جاتے رہے

مبارک تھیں وہ ہستیاں جو اپنا فرض ادا کر کے عالم ارواح میں پہنچ گئیں اور اپنے نقش قدم اخلاف کی رہبری و ہدایت کے لئے چھوڑ گئیں۔

اے فردوس بریں کے تاجدارو! تم باغ ارم کی خوشہ چینی میں مصروف ہو لیکن ذرا دیکھو تو تمہاری لگائی ہوئی پھلواری میں کیسی خزاں آگئی ہے۔ اے تہمتنان سلا! تم نے اپنے دشمن کو مغلوب کر کے دنگل چھوڑ دیا لیکن حریف تمہاری آل و اولاد کو داؤں پیچ سے پیس رہا ہے۔ اے شمشیر زنان اسلام! تم نے رن لے کر اپنی تلواریں میان میں کر لیں لیکن تمہارا رقیب تمہارے خاندان کا شکار کر رہا ہے۔ یہ خواب گراں بار کب تک۔ یہ تغافل

دبے اعتنائی کب تک ہے

زخاک اے لالہ سیراب برخیز   چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

ایک ہندی سیاح جو اتفاقاً ادھر پھیری پر آنکلا ہے۔ تمہارے در پر صدا دے رہا ہے

خدارا اس کا ہدیہ سلام قبول کرو اپنی دعاؤں سے اس کی جھولی بھرو اور خالی ہاتھ

اپنے دروازے سے مت جانے دو ہے

خسروا حافظ درگاہ نشیں فاتحہ خواند   وز زبانے تو تمنائے دعائے دارد

....

....

رات زیادہ آگئی ہے۔ نیند کا غلبہ ہے۔ اشہب قلم خدا جانے کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہے اس لئے

اس ہزیان سرائی کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ اگر فرصت ملی تو ماتقی بند اس مرثیہ کے پھر کبھی

سنائے جائیں گے۔۔ یار زندہ صحبت باقی۔ امید کہ کرنل صاحب رو بصحت ہونگے۔ اُن کو

میرا سلام شوق اور عزیزان کبیر و ادریس کو دعا پہنچا دینا۔ فقط

(۲)

سلا

صبح کو ہوٹل کے ایک آدمی کو لے کر حضرت احمد نجانی کے روضۂ مبارک پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا۔ مزار کا قبہ نہ مرتفع ہے اور نہ احاطہ ہی کشادہ ہے۔ صبح کے وقت وہاں بجز ایک خادم کے اور کوئی شکل وصورت بھی نظر نہ آئی۔ میں نے فاتحہ پڑھا خادم نے ہوٹل کے آدمی سے میرا حال دریافت کیا اور پھر زبانِ سوال کھولی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک

ٹکڑا سبز پارچہ کا تقریباً دو بالشت چوڑا اور چند ورق گلاب کے تربت مبارک سے مس کر کے مرحمت فرمائے۔ میں نے ایک فرانک نذر کیا اور سلام و درود پڑھکر باہر نکلا

حضرت سیدی احمد تیجانیؒ کا مسلک صلح کن و آشتی پسند تھا معبود برحق کی رضاجوئی کے ساتھ ساتھ نصرانی فروغ کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ ریاست جے پور میں بھی ایک بزرگ حضرت آخوند جی مرحوم و مغفور کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی اقتدار کے ہمیشہ دعاگو رہے۔ کیونکہ دنیاوی عروج کو تائید ایزدی کا پرتو سمجھتے تھے اور ظاہر ہے کہ عاشقان راہ خدا اپنے محبوب کے ہر فعل پر فدا رہتے ہیں۔ درگاہ شریف کے موجودہ سجادہ نشین ایک فرانسیسی نصرانیہ کے بطن سے ہیں۔ ان کے والد مرحوم کا حسن و جمال دیکھکر ایک فرانسیسی چھوکری شہر بوردو کی کہ جہاں ان کا استقبال اولین جنگ جرمنی و فرانس میں بڑے تزک و احتشام سے ہوا تھا فریفتہ ہو گئی تھی چنانچہ موجودہ سجادہ نشین اسی فرانسیسی چھوکری کے بطن سے ہیں اور حکومت فرانسہ کے معاون و مددگار۔

اسی روضہ کے قریب ایک دوسرا روضہ حضرت بن حسونؒ کا ہے جہاں عقیدتمند سفر سے پہلے اپنا پاتراب رکھتے ہیں۔

روضہ کے متصل جامع مسجد واقع ہے اور اس سے ملی ہوئی عمارت قدیم شاہی مدرسہ دینیات کی ہے جس کا دروازہ رنگین ٹائل کی بدولت خوبصورت معلوم ہوتا ہے مدرسہ سلطان ابوالحسن کی یادگار ہے لیکن اب تباہ حال ہے اور میں جس روز وہاں گیا تھا تو گنتی کے دو مفلس متعلم مقیم تھے جن کی گذر لنگرخانہ کی روٹیوں پر تھی۔

اس کے بعد شہر سلا کی سب سے مشہور منڈی فندق عسکر دیکھنے گیا جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ مولائی بوعنان نے اس کو شفاخانہ کے لئے تعمیر کیا تھا اور اس کے عہد میں

یہ دارالشفا بہت مشہور و نیکنام تھا لیکن اب فرانسیسی پیٹیر یا ٹڈیکا کے سامنے شیخ الرئیس کا قانون گر گیا ہے اور یہ دارالشفا واقعہ سوق الغزل شیم و روغن کی ایک معمولی منڈی میں مبدل ہو گیا ہے۔

....

....

شام کو میں سلا سے پھر لوٹا کس طرح پژمردہ خاطر اور حرمان نصیب۔ متاسف و ملول رنجیدہ و غمگسار۔ مایوس و ناکام۔ آخری روز ارادہ کیا کہ لاؤ احمد بن ناصری مصنف کتاب الاستقصار کی اولاد سے ملتے چلیں معلوم ہوا کہ ان کی ایک بھتیجی بہو یہاں اس وقت ہے اور اسی سے ان کے گھر کا چراغ روشن ہے ورنہ کوئی بھی یہاں نہیں ہے۔

احمد غیلان کے نام خطوط تعارفی لایا تھا لیکن وہ وزان گئے ہوئے تھے۔

مدرسہ جامع احمد حاجی واقعہ سویقہ میں گیا کہ وہاں کے مدرسین ناموران سلا کی غزوات سے مطلع کر سکیں لیکن فرانسیسی احتساب سے خائف تھے اور غالباً تاریخ قدیم سے بھی ایسے ہی نابلد و بے خبر تھے جیسے دیگر آئمہ اسلام۔ غرضکہ ڈیڑھ دن اسی طرح کوچہ بکوچہ پھرتا رہا کبھی مکانات سلا کو دیکھتا کہ جن پر غرناطی مکانات کی تقلید میں نشان پنجہ مثل محرمی علم بنا رہتا ہے کبھی ملاح کی آبادی کا قدیم اندلسی آبادی سے مقابلہ کرتا کبھی قیصریہ کا چکر لگاتا جہاں مغرب اقصیٰ کی کوئی چیز بازار بھر میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملے گی۔ کبھی برج الجدید سے نکلکر نہانے کے گھاٹ پر خونفشاں ہوتا کہ اس کے ساحل پر ایک اسلامی کشتی بھی نظر نہیں آتی کبھی باب سبتہ کی چوٹی پر چڑھ کر عالم اسلام کو دیکھتا اور حد نظر تک غیر ملکی حکومت کا اثر و قبضہ دیکھکر رنجیدہ ہوتا۔

سلا! بارھویں صدی کا زندہ وخود مختار۔ فاتح وکشور کشا۔ شناور و نبرد آزما سلا نہ تھا بلکہ بیسویں صدی کا مغلوب و مفتوح۔ مظلوم و ستم رسیدہ۔ مفلوج و مقہور مُردہ سلا تھا کہ جس کی سیاحت نے دل کو داغدار کر دیا۔

میں وطن سے حزین و ملول پھرا
نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا
وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

فضحالہ

ابھی دار البیضا دور ہے۔ موٹر سمندر کے کنارہ کنارہ جا رہی ہے دائیں طرف چند بنگلے نظر پڑے۔ میں نے ایک ہمسفر سے دریافت کیا کہ یہ کونسا مقام ہے معلوم ہوا کہ فضحالہ ہے پہلے یہ مقام اجڑا ہوا تھا لیکن اب نسل کشی اسپان کا فارم یہاں کھل جانے سے بہت سی فرانیسی ڈاکٹر۔ سالوتر وغیرہ یہاں رہتے ہیں۔ سال میں دو بار گھوڑ دوڑ بھی ہوتی ہے اور اُس زمانہ میں پولو بھی ہوتا ہے۔ گلف کا کھیل تو روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ سر دین مچھلی بھی اس ساحل پر بکثرت ملتی ہے اور فرانیسی کہار اس کو پکڑ کر ڈبوں میں بند کر کے یورپ کو بھیجتے رہتے ہیں۔

میں نے اس وقت تو یہ مقام نہیں دیکھا کیونکہ موٹر یہاں نہیں رُکی لیکن دار البیضا سے منیجر صاحب پو ہومل موٹرانہ کرتے ہوئے یہاں لے آئے تھے۔ اور انھیں کا بیان ہے کہ یہاں کی آب و ہوا بہت لطیف و صحت بخش ہے۔ ہوٹل مرامیر کے رسٹوران میں بیٹھکر فرانس کی مجلس طرب کے نظارے دیکھے جس کو دیکھو بدمست بنا ہوا ہے۔ جام و سبو لہو لعب۔ دولت و حکومت عیش و نشاط کی بے فکریاں دیکھنے کے لئے شام کے وقت

کسی دار الضیافت میں ایک گھنٹہ چلا جانا کافی ہے۔

دار البیضا

میرے لئے دار البیضا میں ایک دن ٹھیرنا دوبھر ہوگیا اور اگر چند ہندی بھائی بالخصوص منتظمین دوکانات چیلارام و پوہوں نے میری دل جوئی نہ کی ہوتی تو ہوٹل ایل سیر میری یاوہ گوئی سے پاک وصاف رہتا لیکن کیا کیا جائے شیشۂ دل کو جب ٹھیس لگتی ہے تو صدا دینے لگتا ہے۔

بارہ بجے دن کو جب میں اس صاف و آراستہ و باقاعدہ تعمیر شدہ شہر میں پہنچا اور ہوٹل مندرجہ بالا کے ایک کمرہ میں سامان رکھ کر دیوان خانہ میں کھانے کی انتظار میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک فرانسیسی مصور جو رباط سے میرا ہمسفر تھا آگیا اور شہر کی آراستگی و خوش نظمی پر فخر و مباہات کرنے لگا۔ باغات کی لطافت۔ سڑکوں کی صفائی۔ دوکانات کی آرایش۔ ذخائر کی فراوانی۔ تجارت کی گرم بازاری۔ رقص و سرود کی افراط۔ آب و ہوا کی پاکیزگی۔ امن و عافیت کی زندگی ایک ایک کر کے گنا رہا تھا۔ بالآخر جب اس نے یہ کہا کہ فرانس نے اس "تاریک" ملک میں بڑی قربانی کی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور سنجیدہ بنکر ٹوکا کہ یہ بھی بتلاؤ کہ اس "تاریک" مگر دولت مند و زرخیز ملک سے فرانس کی عظمت و اقتدار۔ دولت و تجارت۔ روزگار اور آبادی میں کس قدر اضافہ ہوا۔ قربانی کے لئے ملک فرانس کا رقبہ کیا کم ہے۔ خود دار السلطنت پارس کا گندہ لاطینی محلہ۔ مارسیلز کی تنگ و متعفن گلیاں۔ گراس اور گنؔ۔ بوردوؔ۔ لیونؔ۔ کیلےؔ کے ناہموار راستے۔ پہلے درست کر لیتا۔ پھر ادھر قدم رکھتا۔ اپنے یہاں کے فاقہ مست۔ آوارہ مزاج مخلوق کی اصلاح

مقدم تھی۔ شانز ایلی زے کی رونق آج ختم ہو جائے۔ اگر فرانس کے مقبوضات اس سے نکل جائیں۔ کازابلانکا کے زرق برق پری جمالوں کے اعمالنامے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کوئی فرانس کی گوالن ہے اور کوئی مہترانی۔ حکام ضلع کی حقیقت دریافت کرو گے تو ان میں سے کوئی موچی نکلے گا اور کوئی کاچھی۔ مغرب اقصٰی کے ایک معمولی ٹھیکیدار محکمہ تعمیرات کو ملک کا ملک دبا لینے کا کونسا حق حاصل ہے لیکن آج تہذیب جدید میں تجارت کے حیلے سے۔ ٹھیکہ کے بہانہ سے۔ ریل کی آڑ میں۔ ہوائی پرواز۔ نباتاتی تحقیقات۔ پہاڑوں کی پیمایش اور ترتیب نقشہ جات کے پردہ میں طبی مشن اور مفت اشاعت تعلیم کے پھندوں سے کمزور ممالک پر قبضہ ہو رہا ہے۔

سلسلہ کلام طول پکڑتا جاتا تھا اور اگرچہ مکالمہ بالکل دوستانہ طریقہ پر ہو رہا تھا اور گرمی کا اظہار مطلق نہ تھا لیکن پھر بھی اچھا ہوا کہ اس تلخ نوائی کو جیت مل نے توڑا اور مجھ سے کہا کہ کھانا کھا لیجئے ورنہ سیر کے لئے وقت باقی نہ رہے گا۔

دار البیضا کہ جس کا خالص اسپانوی ترجمہ کازابلانکا ہے۔ بہت خوبصورت و خوشنما شہر ہے۔ راستہ صاف۔ عمارات خوشنما۔ حفظان صحت کا پورا انتظام لیکن یہ سب کچھ جدید افرنجی شہر میں ہے۔ غریب عربوں کا محلہ ویسا ہی تنگ و تاریک ہے جیسے ہندوستان کے اکثر شہر۔

وسط شہر میں گھنٹہ گھر ہے جہاں موٹروں کے اجتماع۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی کثرت سے ہر وقت چہل پہل رہتی ہے۔

مساجد جامع الشلوح۔ جامع اکبر۔ جامع حمرا کو دیکھا۔ محلہ آتش بار سے گذرا تو تن بدن میں آگ لگ گئی کہ اسی جگہ غریب غیر مسلح بے زبان معصوم بچے زن و مرد بوڑھے جوان

بلا کسی تفریق و امتیاز محصور کر کے توپ سے اڑائے گئے تھے ۔ یہ سڑک جس پر موٹر شل کشتی دخانی پھسلتی ہوئی چلتی ہے ۔ عربی لہو سے دریا بنی ہوئی تھی ۔ کلمہ گویاں کی لاشیں تلے اوپر پڑی تھیں ۔ آگ اور گولہ کی بارش ہو رہی تھی ۔ زخمیوں کے کراہنے عورتوں کی آہ و زاری بچوں کے بلکنے سے یہ میدان ایک محشر ایک مسلخ ایک مذبح بن گیا تھا ۔ تین روز تک لاشیں سڑتی رہیں ۔ چیل ۔ کوے ۔ گدھ ان پر ٹوٹتے تھے اور کوئی اٹھانے والا نہ تھا معشوقہ فرانس کو جو کالی دیبی سے زائد خون کی پیاسی ہے نو آدمیوں کے انتقام میں ہزارہا بے گناہوں کا خون چوس کر بھی چین نہ پڑا ۔ اور جب تک سارا ملک ہضم نہ کر لیا ھل من مزید کا نعرہ لگاتی رہی ۔

یہاں کے باشندے حضرت سیدی بلیوت رح کے بہت معتقد ہیں اور ان کی درگاہ پر ہر وقت میلہ سا لگا رہتا ہے ۔ درگاہ میں ایک جھرنا بھی ہے جس کا پانی ایک مجاور نے ایک کٹورہ میں مجھ کو پیش کیا ۔ میرے انکار پر اس نے بڑبڑانا چاہا لیکن فرانک کا ابیض نورانی اس کے تلخ و غضب آلود ہونٹوں پر تبسم پیدا کرنے میں اس درجہ کامیاب ہوا کہ میرے دامن کو بوسہ دینے لگا ۔ اس کا بیان تھا کہ حضرت بلیوت رح شیر کی سواری کرتے تھے اور اب بعد وصال ان کے مزار پر شیر جھاڑو دیا کرتا ہے ۔ میں نے پوچھا کہ جب فرانس کا کالا دیوا اپنے مزدوروں کے انتقام میں ۳۰ ؍ جولائی ۱۹۰۷ء کو شہر پر ایک درجن آہن پوش جہازوں سے آگ برسا رہا تھا تو حضرت موصوف کیا کر رہے تھے اس کا جواب آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر یہ دیا کہ قسمت !

سنت

بیر رشید سے چلکر تقریباً پون گھنٹہ میں ہم شہر سنت پہنچے جہاں چاء کے لئے بہت لوگ اتر پڑے۔ میں بھی اترا اور ابھی ہوٹل کے باہر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک بزرگ۔ نیک صورت خوش پوش میرے پاس سے گذرے۔ ان کی نورانی صورت۔ سفید ریش۔ صاف و بیداغ سفید عربی لباس کو میں نے گھورا۔ اور انھوں نے میری کرسٹانی ہیئت ملاحظہ کی اور بغور دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ اور جب تک وہ مسجد میں جو سامنے ہی تھی داخل نہ ہو گئے میں بھی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اُن کی نگاہ میں خدا جانے کون سی مقناطیسی قوت تھی کہ دل ان کی قدمبوسی کے لئے بیتاب ہو گیا۔ مقامی ایجنسی کے پاس ہی موٹر کھڑی تھی میں نے کارندہ سے کہا کہ آج میں یہاں بوجہ کسل رُکنا چاہتا ہوں۔ شاید کسی اور حالت میں اس کو کچھ تامل ہوتا لیکن ایک گورے فرانسیسی ”فرمانروا“ کے لئے موٹر میں جگہ درکار تھی اس لئے بخوشی منظور کر کے میری جگہ اس کو دیدی۔ میں رخت سفر لے کر اسی ہوٹل میں جو سرائے کی قسم کا تھا اتر پڑا اور سامان رکھکر مسجد کا رُخ کیا۔ وہ بزرگ وضو کر کے جماعت کے انتظار میں کھڑے تھے میں نے السلام علیکم کے بعد صحن میں قدم رکھا۔ جواب میں صرف انھیں بزرگ کی شیریں آواز نکلی۔ وضو سے فارغ ہو کر آگے بڑھا لیکن اجنبیت کی وجہ سے لب کشائی کی جرارت نہ ہوئی۔ نماز عصر انھیں بزرگ نے پڑھائی۔ جماعت میں بارہ تیرہ آدمی تھے فرض کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح سے ان سے گفتگو شروع کروں کہ انھوں نے بسم اللہ کر دی اولاً عربی اور پھر فرانسیسی میں مخاطب کیا۔ اور جب میری ٹوٹی پھوٹی گنگا جمنی عربی فرانسیسی میں شوق سیاحت و ذوق تاریخ کا حال سنا تو ہاتھ کا بوسہ دیا۔

مدیونہ

دارالبیضا سے موٹر جب مراکش کو چلی تو دو تین میل تک سڑک کے ہر دو جانب عمدہ عمدہ باغات بنگلے اور کچھواڑے نظر پڑے جو زیادہ فرانسیسیوں کے تصرف و کاشت میں ہیں بربر مسلمان مثل زرخرید غلام قلبہ رانی وغیرہ کے کام پر مامور ہیں۔ آمدنی کا بیشتر حصہ غیر ملکی دخیل کاران کی جیب میں جاتا ہے۔ تقریباً تیرہ میل چل کر ایک قصبہ مدیونہ نامی ملا لیکن ہماری موٹر آبادی کے باہر باہر نکل گئی۔

بیر رشید

تیس میل پر پہنچکر قصبہ بیر رشید ملا۔ موٹر نے چند منٹ کے لئے دم لیا کیونکہ یہاں سے ایک فرانسیسی مسافر سوار ہونے والا تھا۔ موٹر ایک چھوٹی سی سرائے کے پاس رُکی جہاں چند فرانسیسی کاشتکار ٹھرا چڑھا رہے تھے۔

یہ فرانسیسی نوآبادی ہے۔ علاقہ کا علاقہ فرانسیسی آبادکاران سے بھرا ہوا ہے چھوٹے چھوٹے بنگلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ ان فرانسیسی مہاجرین کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے جو فرانس میں بوجہ بے روزگاری فاقہ کشی کے مصائب برداشت کر رہے تھے ان لوگوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ عرب زمیندار بے دخل کر دیئے گئے ہیں اور ان کی آراضیات کوڑیوں کے مول فرانسیسی مزدوروں کو دیدی گئی ہے۔ زمین زرخیز، آب و ہوا لطیف اور پانی بافراط ہے۔

ہم دونوں مسجد سے نکلے۔ میں نے ان کو ہوٹل میں مدعو کیا۔ لیکن ذرا دیر کھڑے رہنے کے بعد انھوں نے اپنے گھر لے چلنا چاہا۔ میں نے تامل کیا۔ انھوں نے اصرار کیا۔ آخر میں نے سر تسلیم خم کیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ تقریباً پانچسو قدم کے بعد ان کا گھر آگیا۔ اک پٹہ دروازہ ایک ہشت سالہ لڑکی نے کھولا۔ ہم نے بروٹھہ میں قدم رکھا۔ بزرگ ایک منٹ کے لئے اندر تشریف لے گئے اور پھر واپس آنکر مجھ کو ایک مختصر سے کمرہ میں جسے دیوان خانہ بنا رکھا تھا لے گئے۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ وہ بہت ہی آسان عام فہم عربی و فرانسیسی بول رہے تھے جس کے سمجھنے میں چنداں دقت نہیں ہوئی۔ میری سیاحت انگلستان و اندلس فرانس و ترکی کے حالات دریافت کرتے رہے۔ ہندی مسلمانوں کی دولت۔ علم دوستی اور بیداری سے بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ مسلمانان عالم کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہاں میں کیوں اترا۔ اور میرے جواب پر کہ آپ کی نورانی صورت کھینچ لائی۔ بیحد مسرور ہو کر فرمایا کہ پھر ہوٹل میں ٹھیرنے کی کیا وجہ۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے نہ مانا۔ اتنے میں قہوہ آگیا ایک تھالی میں شکر پارے۔ کیلہ اور نارنگیاں بھی تھیں کئی پیالیاں قہوہ کی مجھ کو پلائیں اور ہندوستان کے حالات دریافت کرتے جاتے تھے۔ اتنے میں مغرب کا وقت آگیا۔ ہم دونوں نے مسجد میں نماز پڑھی۔ اس کے بعد مکان آئے کھانا کھایا جس میں مرغ کُس کُس اور شوربا کے علاوہ حلوہ بھی تھا اس کے بعد وہ مجھ کو ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ دوسرے روز بھی دوپہر کا کھانا ان کے یہاں کھایا۔ اور اُن کے ساتھ شہر کو چل پھر کر دیکھا۔ یہ ایک معمولی مقام ہے اور بلند شہر۔ اناؤ۔ بارہ بنکی وغیرہ کی برابر آباد ہو گا لیکن مساجد زیادہ نہیں ہیں۔ فرانسیسیوں کی آبادی بہت زائد ہے اور کئی سو بنگلے اور مکانات ان سے بھرے ہوئے ہیں۔

دوسرے روز چلتے وقت مجھے حضرت سیدی عبداللہ الفہری نے ایک تسبیح مرحمت فرمائی جس کا معاوضہ میں وہاں سے تو کچھ نہ کرسکا۔ البتہ ہندوستان پہنچکر ایک نقرئی ڈبیہ کٹک کی ان کی لڑکی کے لئے بھیجدی۔

سنت تا مراکش

سنت سے دوسرے دن سہ پہر کو کاروانی موٹر ملی۔ اگلی نشست مجھے نہ مل سکی دوسری قطار میں کونہ کی آرام دہ کرسی کو غنیمت سمجھا۔ سامان رکھا اور سنت کو خداحافظ کہکر آگے بڑھا راستہ میں چھوٹی بڑی آبادیاں ملتی جاتی تھیں لیکن ہماری موٹر کہیں نہ رُکی۔۔ ایک دو قصبہ سڑک سے کسی قدر ہٹ کر ملے جن کی فصیل قلعہ جات اور گڈھی نما عمارات سے معلوم ہوتا تھا کہ امراء کی بستی ہے۔ مشرہ بن ابو اچھی آبادی ہے۔ الاربع۔ سدی عمر بالحاج سدی المعاتی بن جریر۔ نزہتہ العدن۔ سدی بوعثمان۔ سدی احمد بالخود کی آبادیاں ملیں۔ آخر میں دریائے تان سیفت کا پل پڑا۔ کھجوروں کے باغات نے مرابطی و موحدی حملہ آوروں کو فرودگاہوں کا پتہ دیا کہ انھیں کے پڑاؤ کے زمانہ میں یہ گٹھلیاں ڈالی گئی تھیں جن سے اب جُھنڈ کے جُھنڈ مضافات مراکش کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جُھنڈوں سے نکلکر مراکش کی افرنجی چھاؤنی ملی۔ جو صدہا برقی لیمپوں سے جگمگا رہی تھی۔ یہاں صرف ایک فرانسیسی فوجی افسر اُترا۔ پانچ منٹ بعد مراکش آگیا۔

مراکش

(سطور مندرجہ ذیل اُس خط سے منقول کی گئی ہیں جو میں نے اپنے برادر عزیز ڈاکٹر

سلطان احمد پتھالوچٹ واسٹنٹ سرجن بھوپال کو لکھی تھیں۔ (ولی محمد)

رحامی⊖ دف کی شور۔ شلحی⊖ مغنی کی الاپ۔ دکالی⊖ رجزگو کی لحن۔ درعی⊖ واعظ کی تبلیغ حاجی⊖ قصہ گو کی خوش بیانی۔ طدغی⊖ خوانچہ فروش کی بانگ۔ تنتی⊖ حریرہ فروش کی جھنکار۔ ترروانتی⊖ شعبدہ باز کی چابکدستی۔ چابک کی چٹک۔ موٹر کی پوں پوں۔ فقیر کی صدا قلیوں کی چھین جھپٹ اور دلّیل ورہبر کی خود ستائی کے ہنگامہ میں میں نے اس مخزنی شہر مراکش کے جسے ازمنہ ماضیہ میں مراکش نامی رہزن کی جائے سکونت اور امیرالمسلمین یوسف بن تاشفینؒ کی تعمیر سے افتخار حاصل ہے جس کی درسگاہ میں ابن طفیل۔ ابن زہر۔ ابن رشد جیسے فیلسوف درس دیچکے ہوں جس کے تحفظ وبقا میں "سبعۃ الرجال" ٭ کی ادعیہ فراوان شامل حال رہی ہوں) میدان جامع الفنا میں شام کے وقت ایک کاروانی موٹر سے باہر قدم نکالا اور خوش تھا کہ جس مقام کے دیدار کے لئے عرصہ سے تڑپ رہا تھا اس میدان محشر نما میں اس وقت اپنے آپ کو پا رہا ہوں۔ اس وسیع میدان میں جس پر سیمنٹ کا فرش بچھا ہوا ہے اس وقت ہنگامہ محشر بپا ہے۔ ایک میلہ ہے کہ جس میں بھانت بھانت کا آدمی موجود ہے۔ ایک نمائش ہے کہ جس میں ہر قسم کی چیز رکھی ہوئی ہے۔ ایک چھوٹی بستی ہے کہ جس میں ہر طبقہ کا نمائندہ حاضر ہے۔ اگر ایک طرف کباب وکلیجی کی چراہند سے دماغ پراگندہ ہے تو دوسری طرف لذیذ مٹھائی کے ڈھیر دیکھکر دیہاتیوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہی کہیں مقامی موٹی گٹھلی کی کھجور کا ڈھیر لگا ہوا ہے تو کہیں سجلماسہ اور زاب کی شیریں بیدانہ خرما کے خوشہ قرینہ سے جمے ہوئے ہیں کہیں کنجڑے۔ قصائی اور ماہی گیر کے سامان سے چیڑ کے

⊖ قبائل کے نام ہیں اور جو قبیلہ جس خصوصیت سے مشہور ہی۔ اس کا نمونہ روزانہ میدان جامع الفنا میں نظر آتا ہی۔

٭ مراکش کے ہفت اقطاب کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) سیدی ابوالعباس (۲) مولائی القصور (۳) سیدی سلیمان (۴) سیدی عبدالعزیز (۵) سیدی قاضی عیاض (۶) سیدی یوسف ابن علی (۷) سیدی

ٹوٹے پھوٹے صندوق اور کھجور کے ٹوکرے پڑے ہیں کہیں مونگ پھلی بھوسی۔ اور خشک انجیر سے تختہ پٹا ہوا ہے۔ مکناسہ کے ملمع دار زیور اور زریں سرخ مخملی زنانی جوتیاں ٹمٹماتی ہوئی دیسی چراغ کی روشنی میں جگمگا رہی ہیں۔ دراز ریش یہودی ایک مختصر سی سیاہ ٹوپی چندیا پر جمائے سیاہ عبا پہنے لیون کے ریشم اور بوردو کی سوتی پارچہ پھیلائے بیٹھا ہے۔ پاس ہی ۴۰، ۵۰ بربری دہقان سر پر کاٹھیاواڑی طرز کے سفید عمامہ باندھے دوہرے برانس پہنے زمین پر پالتی مارے وعظ سُن رہے ہیں۔ دوش بدوش ایک قصہ خواں اپنی طلاقت لسانی کے جوہر دکھا رہا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھو تو ایک شاعر رجزیہ اشعار سنا کر داد سخن کا طالب ہوگا۔ قریب ہی بندر بندری کا آخری تماشہ ہو رہا ہے۔ ایک سپاہی اپنی توڑے دار بندوق اچھال اچھال کر اپنے کارنامہ ہائے شجاعت بیان کر رہا ہے۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب۔ بچہ جوان بوڑھے۔ دیسی اور پردیسی غرضکہ نادان و ناواقف مخلوق کا تانتہ لگا ہوا ہے۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں اور آس پاس کی زمین پر بھی ایسا مجمع لگا رہتا ہے لیکن بہت چھوٹے پیمانہ پر۔

شام ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ہزار دو ہزار کا انبوہ موجود ہوگا۔ میں موٹر سے اتر کر دم لینے بھی نہ پایا تھا کہ بربری لڑکوں نے چھاپہ مارا کسی نے کیمرہ پر ہاتھ رکھا اور کسی نے اٹاچی کیس گھسیٹا۔ ایک نے چھتری کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوسرے نے دوربین ٹپکنا چاہی ہیں نے سامان بریک کی ہلٹی نکالی ہی تھی کہ ایک قلی نے ہاتھ سے اُچک لی۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ بچہ کو دھپ رسید کیا۔ نو عمر کو ڈانٹ بتائی اور بوڑھے کو نرمی سے علیحدہ کیا۔ ہوٹل ہیمونیہ کے جمعدار کو جو موٹر لے کر آگیا تھا اشارہ کیا اور ہلٹی حوالہ کر کے فرودگاہ کی راہ لی۔

میدان جامع الفنا ہوٹل پہنچکر گرم غسل سے تکان سفر دور کر کے بعد ڈنر شوق زیارت میدان جامع الفنا کی طرف لے چلا جو انسان کی بے کسی و لاچاری کی ایک زندہ تفسیر ہے عین اس

مقام پر جہاں سہ پہر کو انبوہ خلائق سے تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی احمد المنصور کا ارادہ ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرانے کا تھا لیکن قزاق اجل نے سارے حوصلہ سارے ولولہ خاک میں ملادیئے۔ مسجد تو نہ بنی لیکن عرصہ تک یہ میدان مقتل عام کے طور پر مشہور رہا اور اب آج کل تو گدڑی بازار کہنا ناموزوں نہ ہوگا جہاں شہر کے غربا وجہلا خرید و فروخت اور تماشہ کے لئے ہر وقت جمع ہو جاتے ہیں۔

میدان جامع الفنا میں آدھ گھنٹہ سے زائد ٹھہرا اور چل پھر کر خوب دیکھا۔ ۱۰½ بجے جب پیادہ پا ہوٹل پہنچا تو خراب وخستہ ہو گیا تھا لیکن ناموران مراکش کی یاد نے دیر تک بے چین رکھا۔ شوق کہتا تھا کہ صبح کو ابن زہر کے مطب میں درد دل کا علاج کراؤں گا۔ ابن رشد کے درس میں زانوئے ادب تہ کروں گا۔ حضرت سلمان جزولی کی بارگاہ میں دلائل الخیرات کا مطالعہ کروں گا۔ زینب کا نگار خانہ۔ الحباب کا شیش محل۔ یوسف بن تاشفین کی فرودگاہ سبعۃ الرجال کی درگاہوں سے برکات حاصل کروں گا۔ اولین مرابطی فرمانروا کی شان و شوکت کا جلوس دیکھوں گا۔ اور ناعاقبت اندیش عبد العزیز کی ملک فروشی سے عبرت حاصل کروں گا۔ غرضکہ اس پریشان خیالی کا سلسلہ کہ جس میں یوسف بن تاشفین کا تصور سب سے زیادہ ممتاز تھا دیر تک قائم رہا تا آنکہ غلبہ خواب نے دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔

کجا دوم بہ کہ گویم ترا نمی دانم ۔۔۔ بجستجوئے تو امشب بخواب می رفتم

مزار یوسف بن تاشفین

اے صبا گر بگذری بر دامن تنیفت غرب
بوسہ زن بر خاک آں وادی و مشکیں کن نفس
منزل یوسف کہ بادش ہر دم از ماصد سلام
پر صدائے سارباں بینی و آہنگ جرس

تربت جانان بہ بوس انگہ بزارے عرصہ دار

کز فراقت سوختم اے مہرباں فریادرس

صبح کو آنکھ دیر میں کھلی لیکن رات کے گرم غسل نے تکان دور کردیا تھا اس لئے صبح کو جب اٹھا تو بالکل چاق وچست تھا۔ محمد دلال کا انتظار کیا لیکن جب اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو نقشہ بلدیہ مراکش۔ دوربین۔ کیمرا۔ قطب نما لے کر تنہا چل کھڑا ہوا۔ شوارع میں سناٹا تھا۔ بڑی دوکانیں بند تھیں۔ سڑکوں پر ایک آدھ راہ گیر کے سوا اور کوئی نہ دکھائی دیتا تھا میں سیدھا جامع کتبیہ پر پہنچا اور وہاں سے قبلہ رو ۳۰۔ ۴۰ سوگز کے فاصلہ پر ایک مسطح لیکن ویران۔ گندہ کھیت میں کہ جس کے کانس کی ٹھونٹ اس کے بنجر ہونے کی شہادت دیرہے تھے۔ چند نوربافوں کو کارگاہ کھادی کی تگ وپو میں رواں دواں دیکھ کر دل نے کہا کہ لاؤ ان سے پوچھ دیکھوں لیکن جذبہ بے اختیار اتنی کب اجازت دینے لگا تھا۔ وفور شوق وثوق کے ساتھ ایک فراموش کردہ خرابہ کی طرف اشارہ کرکے پکار رہا تھا کہ

تنکے چنتی نظر آجائے گی حسرت میری
پوچھنا بھی نہ پڑے گی تمہیں تربت میری

غیر مسقف احاطہ کی بوسیدہ دیوار اشکبار تھی کہ غازی اسلام۔ شہید ملت۔ فاتح اندلس سرکوب نصاریٰ اسبانیہ۔ بانی مراکش۔ سرآمد امرائے مرابطین۔ حریف معتمد کی پاسبانی کا شرف اسی مشت خاک کو حاصل ہے اور وہ شیر خدا جس نے ایک وسیع سلطنت کے فرمانروا ہوجانے پر بھی نہ عمدہ کپڑا پہنا اور نہ لذیذ غذا کا عادی معدہ کو کیا جس کی نماز سفر وحضر میں کبھی قضا نہ ہوئی۔ داور محشر سے اپنے قومی و مذہبی جذبات کا صلہ لینے کی انتظار میں خواب نوشیں ہیں ایسا غافل ہے کہ نہ بے مہری زمانہ کا غم ہے اور نہ تغافل اخلاف کا شکوہ۔ روضہ کی ویران حالی۔ شکستہ دیوار۔ اجڑا ہوا مزار دیکھ کر جی بھر آیا۔ نہ کسی پھول کی پنکھڑی

کہیں دکھائی دی اور نہ دوب کا تنکہ نظر پڑا۔ طاق پر دیسی وضع کا ایک چراغ تھا جو رات بھر بے مہری زمانہ کو روتے روتے صبح کو اندھا ہو گیا تھا۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

غرضکہ اس بیقرار و بے چین دل کو لے کر جو تقریباً ۱۰-۱۱ سال سے اس آستان بوسی کی حسرت میں تڑپ رہا تھا۔ سرخ مٹی کے احاطہ کے اندر داخل ہوا اور تربت کے پائتیں مودب کھڑا ہو گیا دل میں سینکڑوں منصوبے تھے کہ یہ کہیں گے اور وہ کہیں گے۔ اس طرح فاتحہ پڑھیں گے۔ یہ دعا مانگیں گے۔ ہزارہا آرزوؤں کا مطالبہ پیش کیا جائیگا کتنی ہی دفاتر شکوہ و شکایت کے کھلیں گے کتنی ہی باتیں راز و نیاز کی ہوں گی۔ اد فنش کی داستان ہزیمت پوچھوں گا۔ اشبیلیہ کا شہر آشوب سنوں گا معتمد و رمیکیہ کی واسوخت پڑھواؤں گا تلمسان کی غزوات۔ مغرب کی مجاہدات دریافت کروں گا۔ زینب کی تجلیات سے بصیرت اندوز ہوں گا۔ اس کی داستان رزم و بزم سے اپنی افسردگی مٹاؤں گا لیکن وائے ناکامی کہ احاطہ میں داخل ہوتے ہی اس ایک تودہ خاک نے مرعوب کر کے مثل بُت خاموش کر دیا چشم اشکبار تھی اور دل سوگوار۔ نظر تربت پر تھی اور تصور میدان زلاقہ کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔

غسل در اشک زدم کہ اہل طریقت گویند
پاک شو اول وپس دیدہ بر آں پاک انداز

اللہ اکبر ایک فقیر بے نوا ایسے مستغنی کے دربار میں حاضر ہے کہ جس کی روح نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی کالبد خاکی پر کوئی گنبد یا مصطبہ تعمیر کرایا جائے جس نے مرنے کے بعد بھی سادگی کا دامن نہ چھوڑا۔ اسی ڈھیر میں وہ امیر المسلمین سو رہا ہے جس کے اونٹوں نے سوس و سوڈان کی دھول اُڑا دی۔ اور جس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے سرانویدا کی چوٹیاں کانپ اٹھیں جس نے بجز جوار اور جو کے دلیہ کے کبھی گیہوں کا دانہ منہ میں نہ رکھا

نہ بکری کا گوشت اور گائے کے دودھ کو چکھا جس کی ستر پوشی کا شرف بجز صوف (اونی گدا) کے اور کسی جامہ کو نصیب نہ ہوا اور نہ کبھی پلنگ پر آرام کیا۔ مقام عبرت کہ جس شہنشا کے خطبہ سے دو ہزار منبر گونجا کرتے تھے آج اُس کے سرہانے بجز ایک ہندی دشت پیما کی سسکیوں کے اور کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ خوش نصیب تھی حرّہ جس کے بطن سے ایسا سپوت پیدا ہوا اور قابل رشک تھا تاشفین جس کے لخت جگر نے یکصد سالہ دور حیات اور ۴۷ سالہ عہد حکومت میں قومی اقتدار کو اس قدر تقویت پہنچائی۔

یوسف بن تاشفین کی ولادت ۴۰۰ھ میں وفات محمود غزنوی سے ۲۱ سال قبل ہوئی ۵۰۰ھ میں، ۴۷ سال حکومت کر کے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنگ زلاقہ ۱۲ رجب ۴۷۹ھ کو فتح سومنات سے ۶۴ سال بعد ہوئی۔ اسی فتح کے بعد یوسف نے امیر المسلمین کا لقب اختیار کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یوسف بن تاشفین اپنی یک صد سالہ عمر میں ایک روز کے لئے بھی کبھی بیمار نہیں پڑا۔ اس کے سکّہ پر ایک طرف وسط میں " امیر المسلمین یوسف بن تاشفین " اور اُس کے حلقہ میں " ومن یبتغی غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین "۔ اور دوسری جانب " امیر عبداللہ امیر المومنین عباسی " مع تاریخ ومقام دار الضرب درج تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے مختلف سکّوں پر مختلف عبارات درج تھیں اشرفی پر ایک طرف " لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ یمین الدولہ امین الملت ابو القاسم " اور دوسری طرف محمد رسول اللہ القادر باللہ ولی عبدہٗ الغالب باللہ مبینی منقوش تھا۔

جامعہ کُتبیہ | ملک مغرب کی وسیع ترین۔ بلند وممتاز لیکن فی زمانہ مرمت طلب وغیر آباد مسجد جس کی وجہ تسمیہ آٹھ سو کتب فروشوں کی دوکانوں کے باعث مشہور ہوگئی تھی۔ شہر کے ایک غیر آباد مغربی گوشہ میں اپنے بانی عبد المومن اولین موحدی فرمانروا کے زہد وتقویٰ اور اپنے

تکمیل کنندہ ابو یوسف یعقوب المنصور چہارمیں موحدی امیر المومنین (ہمعصر شہاب الدین غوری) کی فتوحات اسپانیہ بالخصوص فتح فحص الجدید کا جسمیں اسی ہزار گھوڑی ایک لاکھ خچر چار لاکھ گدھے ساٹھ ہزار زرہ بطور مال غنیمت ہاتھ لگا تھا۔ پانچوں وقت کلمہ پڑھ رہی ہے جامع تقویت الاسلام دہلی کا ہیولی ابھی نہ پڑا تھا اور نہ قطب مینار کی تعمیر کا تصور کسی کو ہوا تھا کہ اس مجاہد اسلام زاہد شب بیدار نے جامع اشبیلیہ کا منارہ خیرلڈا۔ رباط کا منارہ حسن اور کُتبیہ کا عظیم منارہ جو بلحاظ بلندی و استحکام روئے زمین کا اعظم ترین سنگین منارہ ہے تعمیر کرائے۔ یہی وہ سلطان ہے جس کو سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس نے امداد کے لئے ایک خط لکھا تھا لیکن چونکہ القاب میں "امیر المومنین" کے الفاظ درج نہ تھے اس لئے ایلچی کو بے نیل مرام واپس جانا پڑا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ وہ دنیاوی جاہ وجلال اور شہرت وعزت کا طالب تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عین عالم شباب میں کہ نخل حیات ابھی موسم بہار کی لطافت سے صرف ۴۰ بار مستفید ہونے پایا تھا کہ اس نے دولت دنیاوی کو خیر باد کہہ کر "توکلت من اللہ" کا نعرہ لگایا کہ یہ اس کا مالوٹھا اور فقیری اختیار کر کے ارض مقدس میں دمشق کے قریب قریہ جاوہ میں جادہ مستقیم پر صبر ورضا کی منزلیں طے کرنے چلا گیا۔

یہ عبادت گاہ چونکہ آبادی سے دور ایک کونہ میں آگئی ہے۔ اس لئے بجز بھولے بھٹکے مسافروں کے اور کوئی بھی نہیں دکھائی دیتا۔ افسوس جس مسجد میں پچاس ساٹھ ہزار مصلیوں کے لئے مسقف دالان بنے ہوں وہاں اب عصر ومغرب کی نمازوں میں کہ جب مجھے جبہ سائی کا شرف حاصل ہوا تھا پرستاران توحید کی جماعت میں ۲۰ نفوس سے زائد نہ تھے۔ جس خانہ خدا کی روشنی کے لئے کم از کم دوصد برقی فانوس ضروری ہوں اسمیں

بوقت مغرب گنتی کے چار کروسن تیل کی دستی لالٹین کیا روشنی پہنچا سکتی ہیں۔ جہاں کسی زمانہ میں دبیز قالینوں کی جانمازیں مصلیوں کی قدمبوسی کرتی رہتی تھیں وہاں اب موٹی سیتل پاٹی پر جھاڑو دینے والا بھی نہیں ملتا۔

یہ مسجد ابتدائً بہت وسیع تھی لیکن ایک بار خانہ جنگی میں ایک فریق نے یہ خیال کر کے کہ خانہ خدا تیغ و تفنگ کی زد سے محفوظ رہتا ہے اس کو اپنی جائے پناہ بنالیا۔ لیکن فریق ثانی نے اس نظیر پر کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر کا محاصرہ خاص حرم شریف میں کیا گیا تھا اور بیت اللہ پر منجنیق سے پتھر برسائے گئے تھے۔ حریف کا محاصرہ کیا۔ اس کشت و خون سے محصور حصہ مسمار و شکست ہو گیا جس پر علماء دین نے یہ فتویٰ دیا کہ جس حصہ میں جنگ و جدال ہوا ہو وہ بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تقریبًا نصف مسجد شہید کر دی گئی اور اسی وجہ سے منارہ مسجد جو وسط میں تھا اب موجودہ مسجد کے ایک کونہ میں آ گیا ہے۔ منارہ ہفت منزل ہے جس کی بلندی ۲۰۷ فٹ اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے۔ سنہ تعمیر ۱۱۹۶ء ہے۔ (قطب مینار ۲۳۸ فٹ بلند اور ۴۷½ فٹ چوڑا ہے سنہ تعمیر ۱۲۰۰ء ہے) منارہ پر چڑھنے کے لئے زینہ نہیں ہے بلکہ سلامی دار رپٹے بنے ہوئے ہیں جو اس قدر آسان گذار ہیں کہ چوٹی تک گھوڑی کی سواری پر سلطان وقت جایا کرتا تھا۔ اس وقت صرف اولین منزل تک جانے کی اجازت ہے کہ جہاں سے موذن اذان دیتا ہے۔ مابقی منزلوں پر بوجہ بے پردگی کوئی نہیں جا سکتا۔

منارہ کی چوٹی پر چار طلائی لٹو نصب ہیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملکہ نے ایک روزہ کے کفارہ میں چڑھائے تھے یعنی روزہ وقت افطار سے تین گھنٹہ قبل توڑ ڈالا تھا جس کے کفارہ میں اس نے مسجد کتبیہ میں چار طلائی لٹو چڑھائے اور دو دریا ڈُبُم

(وادام الربیع - وادعبید) پل تعمیر کرائے۔

مقابر سعدیئین صبح کو ایک روز میں مراکش کے قصبہ میں گیا کہ جہاں دارالمخزن۔ محل شاہی جامع مسجد قصبہ اور مقابر سلاطین ہیں۔

جامع مسجد ایک مرتفع۔ وسیع اور کشادہ عمارت ہے جس میں بیب کا فرش بچھا ہے لیکن شاید ہفتوں سے منت کش جاروب نہیں ہوا۔ مسجد بھی خالی پڑی رہتی ہے۔ کیونکہ میں نے اس میں دو مرتبہ کی رہ نوردی میں کبھی کسی کو وہاں نہ دیکھا۔ اسی مسجد کے ایک گوشہ سے ایک تنگ۔ پست ناغول نما راستہ مقابر سعدیئین کو جاتا ہے جن کی خوشنمائی اور دلفریبی کا اندازہ باہر سے کسی کو نہیں ہوتا لیکن اندر قدم رکھتے ہی کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست۔ اس کی نازک بارہ دری جالیدار کام۔ سنگ مرمر کے نقش و نگار مینا کار چھت۔ سبک ترین ستون۔ ان پر ہشت پہل محراب سیاح کو گھنٹوں محو رکھتی ہیں۔ شاہجہاں کا وہ اشک محبت جو اس کی پیکر وفا کے سوگ میں ساحل جمن پر تاج محل کی شکل میں منقلب ہو کر "جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز" ہوا۔ گنبد نیلوفری کے نیچے ہمیشہ ممتاز و سر بلند رہے گا۔ اس کا جواب تب ہی ہو سکتا ہے جب ایک دوسرا خاندان مغلیہ ایک دوسرے شاہجہاں کو پیدا کرے اس لئے اس کا مقابلہ روئے عالم کی کسی عمارت سے کرنا سورج کو چراغ ہے دکھانا۔ اسی طرح ہندوستان کے دیگر کوہ پیکر خوابگاہوں کو جو شاہدرہ۔ سکندرہ۔ لکھنؤ۔ سہسرام۔ چین پور۔ مانڈو۔ بیجاپور۔ احمد آباد وغیرہ میں منتشر ہیں اس سبک گہوارہ سے ٹکر کھلانا مقصد نہیں۔ یہ ایک لالہ صحرائی ہے جو سرزمین حمرا میں تعمیر تاج محل سے قبل لہلہا رہا ہے۔ دستار سعدیئین کا گل نسر سبد ہے یا ایک گلدستہ ہے جو اپنی بوقلمونی اور خوشنما پھول بوٹہ کے ساتھ سنگ مرمر کی ساق سیمین سے لپٹ کر اطلس

چینی کی قبہ میں آویزاں ہوگیا ہے۔ جس پر غرناطہ کی دار الاساد۔ جامع قرطبہ کے مقصورہ۔ اور
القصر اشبیلیہ کے کوشک کا دھوکہ ہوتا ہے۔ نزاکت کا یہ عالم ہے کہ نظر بھر کر دیکھا نہیں جاتا کہ
کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔ خلوص محبت کا پیکر نکہت جانفزا کی طرح بلند ہوا اور ساری فضا
میں چھاگیا۔ ایک قبہ میں بانی خاندان قائم بامر اللہ سعدی شمیم فردوس سے اپنا دماغ معطر
کر رہا ہے۔ قائم کو وقت وفات صوبہ سوس میں حضرت سیدی ابو عبداللہ بن سلیمان
الجزولی الحسنی کی درگاہ میں جگہ ملی تھی لیکن ارکان دولت کو اندیشہ ہوا کہ اہل سوس کی خوش
اعتقادی اس لاش کو بھی مثل تابوت حضرت جزولیؒ کہ جس کو وہ اپنے لشکر کے آگے آگے تبرکاً
رکھتے تھے۔ کہیں نہ لے جائیں اس لئے ان کی لاش سوس سے لاکر موجودہ قبرستان میں پیوند
خاک کی گئی۔ ذرا ہٹ کر اس تربت کو دیکھنا جس میں "الشیخ کا قالب بے سر" سلیمان اعظم سلطان
ٹرکی سے انتقام لینے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ سلیمان کو الشیخ کی سیلاب فتوحات
سے کہ جو الجزائر و مصر کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا اندیشہ پیدا ہوا اور اس نے مغلوب و مفتوح
قاسم فطاس کی ملکہ اور ہمشیرہ کی گریہ وزاری پر اپنے ایک مصاحب کو الشیخ کا کام تمام کرنے
کے لئے ملک مغرب کی جانب روانہ کیا جس نے مراکش پہنچکر اپنے آپ کو ترکی مظالم کا ستم
رسیدہ ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ حلقہ ندما میں داخل ہوکر اپنی ظرافت و بذلہ سنجی سے الشیخ کے مزاج
میں اس قدر دخیل ہوگیا کہ ایک بار جب الشیخ جبل اطلس کی شورش دفع کرنے چلا تو یہ بھی ساتھ
ہولیا۔ اور راستہ میں موقعہ پاکر الشیخ کا سر تراش کر کے ہوا ہوگیا۔ فرودگاہ میں ہلچل مچ گئی۔ لشکر
نے تعاقب کیا لیکن سر آگے نکل چکا تھا اور منزل بمنزل کوچ کر کے استنبول کی فصیل پر سلیمان
اعظم کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لئے نصب کیا گیا۔ لاش بے سر جبل اطلس سے لائی گئی اور
باپ کے پہلو میں آرام پذیر ہوئے۔ پاس ہی ایک لحد میں عبداللہ الغالب باللہ جس کا نام

زہد و ورع میں ہمیشہ درخشاں و تاباں رہے گا محوِ خواب ہے ۔ احمد منصور کی جدت پسند طبیعت جس نے Cipher code ایجاد کیا تھا ۔ ایک سیج پر آرام کر رہی ہے مولائی زیدان اپنے کتب خانہ کے غم میں اسبانی دست برد کا نوحہ اسی جگہ کر رہا ہے چمنستان فاطمہ کا کملاتا ہوا پھول ۔ حضرت نفس الزکیہ کا نور نظر ۔ قریش عرب کی آخری یادگار اگر دیکھنا منظور ہو تو مغرب اقصٰی کا سفر کرو ۔ زرہون ۔ فاس ۔ مراکش ۔ شلہ کے کھنڈروں پر رو ؤ اور رباط کے زندہ لیکن بدتر از مردہ مضغہ گوشت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو ۔

خاندان سعدی کا سلسلہ نسب حضرت نفس الزکیہ تک پہنچتا ہے ۔ صوبہ سجلماسہ میں عرصہ تک کھجور کی پیداوار میں کمی دیکھ کر وہاں کے بعض ارادتمند حج سے واپس ہوتے وقت خاندان حضرت نفس الزکیہ کے ایک رکن کو اپنے ساتھ لیتے آئے جن کی دعا اور قدموں کی برکت سے فصلوں میں فراوانی شروع ہوگئی ۔ اس بات کا شہرہ دور دور پھیل گیا صوبہ درعہ میں بھی ایک بار یہی کیفیت ہوئی کہ فصل خراب ہوئی اور یہاں کے عقیدتمند ینبع النخل سے اسی خاندان کے ایک دوسرے بزرگ کو لے آئے ۔ اس طرح پر خاندان نفس الزکیہ کے دو رکن مغرب اقصٰی میں آئے جن میں سے ایک درعہ میں متمکن ہوئے اور دوسرے سجلماسہ میں ۔

درعہ والے ۔ ۔ ۔ بزرگ کی اولاد پہلی حکمراں گذری اور ۱۴۵ سال تک بارہ سلاطین نے حکومت کرکے اپنی جگہ سجلماسی خاندان کے لئے خالی کی کہ جس کا پندرھواں رکن اس وقت زیر ماتحتی فرانس شاہ شطرنج بنا ہوا ہے ۔ درعہ والوں میں سے جس شخص نے سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کا نام ابو عبد اللہ قائم بامر اللہ سعدی تھا اور اسی مناسبت سے اس خاندان کو خاندان سعدیین کہتے ہیں ۔

تاریخ اندلس کو اس خاندان کے ساتھ یہ المناک تعلق ہے کہ مرحوم غرناطہ کا آخری

خارج البلد بدبخت فرمانروا ابوعبداللہ کہ جو تحفظ سلطنت کے لئے تلوار نہ اٹھا سکا۔ مغرب اقصیٰ میں احمد الاعرج سعدی اور محمد الشیخ سعدی کی باہمی خانہ جنگی میں حصہ لینے کے لئے میدان میں اتر پڑا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ اسی خاندان سعدی کی، ہشتمین فرمانروا کے عہد میں نصرانی تعصب اور عیسوی جہاد نے اندلس کی اسلامی آبادی کو کم کرنے کی غرض سے اعلان کیا کہ تین روز کے اندر اندر جو مسلمان جلاوطن ہونا چاہیں وہ جا سکتے ہیں لیکن جسم پر کے کپڑوں کے سوا کوئی چیز اپنے ساتھ نہ لیجا سکیں گے۔ اس کے بعد سب جبراً عیسائی بنا لئے جائینگے اسلامی آبادی کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ صرف ایک ضلع ارغون کے ۱۳۰ دیہات سے ۶۴ ہزار مسلمان الوداع کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ باقی عیسائی بنا لئے گئے۔ اسی زیدان کے زمانہ میں مغرب اقصیٰ کی تین ہزار نادر قلمی کتب اندلس چلی گئیں کہ جن سے اس وقت کتبخانہ اسکوریئل مالامال ہے ورنہ اندلس کی تمام عربی کتابیں کب کی نذر آتش ہو چکی تھیں۔ اسی سعدی خاندان کے گیارھویں فرمانروا نے بجائے "امیر" کے اپنا لقب "سلطان" اختیار کیا کہ جو اس وقت تک جاری ہے۔

قصر بہیہ | رنگیلے۔ بدمست۔ ناعاقبت اندیش سلطان مولائی عبدالعزیز کے حبشی نژاد وزیر بواحمد بن موسیٰ نے اپنے زمانے عروج میں اپنے والد کے تعمیر کردہ محل موسومہ "قصر بہیہ" کی توسیع و آرائش بنی عباد کے مشہور و معروف القصر اشبیلیہ کے نمونہ پر زیر نگرانی الحاج محمد مکی انجنیئر اس سیر چشمی سے کرائی کہ آج اس کے وسیع دیوان۔ مطلا و مذہب کمرے۔ آراستہ خوابگاہ پُرتکلف حمام۔ خوشنما بارہ دری۔ مرتفع شہ نشین۔ دیدہ زیب پائیں باغ۔ مالک کی علو ہمتی۔ انجنیئر کے کمال فن اور بے ثباتی عالم کی ایک زندہ تفسیر ہے۔

بواحمد جسے مغربی عام طور سے بااحمد کہتے ہیں ایک کوتاہ قامت۔ فربہ اندام۔ حبشی

نژاد وزیر تھا اس کی دادی نو مسلمہ اندلسی نصرانی اور ماں نو مسلمہ یہود تھی ۱۸۹۴ء میں
جبکہ یہ جمعدار تھا مولائی حسن مراکش سے رباط آتے ہوئے بمقام تادلہ جاں بحق تسلیم ہوا جمعدار
بو احمد نے خبر وفات مخفی رکھکر ذریعہ تیز رفتار قاصد اس کے دوازدہ سالہ شہزادہ عبدالعزیز
کو جو ایک ترکی خاتون کے بطن سے تھا اطلاع کرادی کہ وہ فی الفور رباط میں اپنی مسند نشینی
کا اعلان کردے اور خود فاس میں اس خوش انتظامی سے اعلان کرادیا کہ کسی کو مخالفت کا
موقعہ نہ ملا یعنی باشائے فاس کو حکم بھیجا کہ جامع جلو دمیں امرائے سلطنت کو بلاکر بیعت بزور شمشیر
حاصل کرائے۔ باشانے ایک گشتی اطلاعنامہ بھیجا کہ فرمان خسروی سننے کے لئے جملہ اکابر ملک کو
جامع جلو دمیں حاضر ہونا چاہیے لیکن جب رعایا کے نمائندے حاضر ہوئے تو مسجد مقفل کردی
گئی اس کے بعد بیعت عبدالعزیز کے لئے حکم پڑھا چونکہ مسجد میں کافی سپاہ بھی داخل ہوگئی
تھی اس لئے کسی کو اختلاف کرنے کی جرات نہ ہوئی حتی کہ عبدالعزیز کے بھائی عمر نامی کو بھی
سر اطاعت خم کرنا پڑا۔ وفات کے چار روز بعد مولائی حسن مرحوم کی نعش رباط الفتح پہنچی سلطان
چونکہ حسب رواج ملک گھوڑوں کے تخت رواں پر سفر کرتا تھا اور ہر وقت پردہ میں ملفوف
رہتا تھا اس لئے اس کی وفات کی اطلاع بجز چند خاص خدام کے اور کسی کو نہ ہوسکی حتی کہ
وزراء و معتمدین بھی لاعلم تھے۔ کاغذات پیشی دو روز تک برابر آتے رہے جن کو بعد احکام
مناسب و تزئین مہر بو احمد جاری کرادیا کرتا تھا۔ خاصہ دونوں وقت جاتا تھا اور چھوٹے
برتن اندر سے واپس آتے رہتے تھے۔ لیکن تیسرے روز جب ابو احمد کے قاصد نے رباط سے
واپس آکر عبدالعزیز کی مسند نشینی کی نوید سنادی تو اس نے بھی لشکر میں اعلان کرکے
عبدالعزیز کی غائبانہ بیعت حاصل کرلی۔ چار روز بعد جب مولائی حسن مرحوم کا کالبد خاکی
رباط پہنچا تو عبدالعزیز نے .... بیرون شہر استقبال کیا اور چونکہ اندرون شہر

کوئی جنازہ باہر سے کسی پھاٹک میں سے نہیں جا سکتا اس لئے شہر پناہ ایک جگہ سے پھوڑی گئی جس میں سے وہ نعش جو ۲۱ سالہ دور حکومت میں فرانس کو فوجی و تجارتی اصلاحات کے بہانہ سے اندرون ملک داخل کر کے درپردہ بنیاد سلطنت کھوکھلی کر چکی تھی۔ دوش بدوش لائی گئی۔ نماز جنازہ ادا ہوئی اور وہ اور اس کے ساتھ سلطنت مغرب کی آزادی ہمیشہ کے لئے پیوند خاک کردی گئی۔

صغیر سن، بھولے بھالے عبدالعزیز کو یورپ نے کس طرح بہلایا ایک داستان خونچکاں ہے جس کے سنانے کا یہ موقعہ نہیں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ نادان عبدالعزیز تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی پھولا نہ سمایا اور چونکہ معراج خلافت تک پہنچنے میں سیدی ابو احمد جمعدار کی امداد شامل تھی اس لئے وہ اور اس کی والدہ اس پر بیحد مہربان ہو گئے۔ مغرب اقصیٰ میں دستور قدیم کے مطابق ہر جدید فرمانروا کی رسم تاجپوشی چار مخزنی شہر (رباط۔ مکناسہ۔ فاس۔ مراکش) میں ہونی چاہیئے۔ عبدالعزیز کی رسم بیعت رباط میں ہو چکی تھی لہذا وہ دوسرے ہفتہ ہی مکناسہ کو روانہ ہوا۔ جلو میں لشکر کے علاوہ سیدی بو احمد اور الحاج معاتی جامع وزیر اعظم اور سیدی محمد الصغیر وزیر عساکر بھی تھے۔ ہر دو موخرالذکر کے آباؤ اجداد اندلس سے جلا وطن ہو کر فاس میں آباد ہو گئے تھے۔ جہاں یہ خاندان علم و فضل دولت و حشمت کی وجہ سے بہت مشہور و نیکنام تھا۔ سیدی بو احمد ایک معمولی جمعدار تھا جس کو ان بھائیوں نے منہ نہیں لگایا۔ مکناسہ میں ایک روز وزیر اعظم نے کچھ کاغذات پیش کئے جن پر بو احمد نے کہ جو نادان عبدالعزیز کے ساتھ مثل سایہ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا کچھ معمولی اعتراض کیا وزیر نے اس سفلہ سے منہ لگنا پسند نہ کیا۔ بو احمد نے چھیڑنا شروع کیا بدتہذیبی بھی برتی اور وزیر پر تغلب۔ صرف بیجا اور دیگر بے عنوانیوں کا الزام لگا کر کہا کہ

یہ جیل کا مستحق ہے۔ جمعدار کے زبردست ہاتھ پاؤں مکرخت آواز خشمناک آنکھوں سے سادہ لوح و نادان سلطان مرعوب ہوگیا جمعدار کو موقعہ مل گیا۔ فراشوں کو آواز دی جنھوں نے بُری طرح سے وزیر کو دھکیل کر جیل خانہ میں جھونک دیا۔ سیدی محمد الصغیر راستہ میں گرفتار ہوا۔ اور ایک ہی جیل خانہ میں ایک ہی زنجیر میں دونوں بھائی گرفتار کر کے ایک ہی کال کوٹھری میں پھینک دیئے گئے۔ یہ تھا اولین کام جس سے عبد العزیز کی حکومت و سیاست شروع ہوئی یہ دونوں بھائی عرصہ تک زندہ رہے۔ پہلے سپہ سالار اعظم کا محبس میں انتقال ہوا لیکن واحسرتا کہ تین روز تک مردہ کے دست و پا سے بیڑی و ہتکڑی علیحدہ نہ کی گئی بلکہ اس زنجیر کو بھی کہ جس سے دونوں بھائیوں کے پیر بندھے ہوئے تھے جدا کرنے کا خیال کسی بندۂ خدا کو نہ آیا وزیر اعظم جب بہت ضعیف و لاچار ہوگیا تو رہا کر دیا گیا لیکن چند روز بعد وہ بھی راہی ملک بقا ہوا۔ انتقال کے وقت اُس نے وصیت کی کہ کفن میں بیڑی و ہتکڑی ضرور رکھدینا تاکہ فردائے قیامت وہ احکم الحاکمین کی عدالت میں دادخواہ ہوسکے۔

قصہ تو یہاں ختم ہوگیا لیکن زمانہ نے بہت جلد انتقام لے کر بتلا دیا کہ

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ۔۔۔ چنداں امان نہ داد کہ شب را سحر کند

جمعدار ابو احمد کا کیا حشر ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسے وزارت غصب کر کے اور اپنے اعزہ کو عہدہ ہائے جلیلہ دے کر لاجواب و پُر تکلف محل بہیہ میں کہ جس کی تعمیر پر لکھو کھا روپیہ صرف کیا گیا تھا تادیر رہنا نصیب نہ ہوا۔ جس طرح وزیر اعظم کا محل "دار جامع" واقعہ شہر فاس اُس کے ہاتھ سے نکل کر ایک ہوٹل بن گیا۔ اسی طرح جمعدار کا محل "بہیہ" بھی اس کی زندگی ہی میں اس کے پاس سے نکل گیا جس نادان سلطان نے بے گناہوں کو تباہ کر کے اپنا وقت کرکٹ سائکل پولو مصوری۔ سرکس۔ تاش میں گذارا اس کو پندرہ برس سے زائد عیش نصیب

نہ ہوسکا وہ آج طنجہ میں اپنی حماقت پر رو رہا ہے۔

اسی بدبخت جعدار کا یہ محل ہے کہ جس کی سیر میں میں مصروف ہوں لیکن کس حالت میں ؟ قصر میں بجائے مسلمان وزیر کے نصرانی گورنر براج رہا ہے۔ دیوان خانہ میں نماز کے بجائے رقص روباہ کے دائرے بنائے جا رہے ہیں۔ تسبیح و مصلے کی جگہ صلیب اور قرآن کی جگہ انجیل نے چھین لی ہلال غروب اور ترسول بلند ہوگیا ہے۔

اجدل | بیرون شہر یہ عظیم الشان باغ تقریباً دو میل لانبا اور ایک میل چوڑا ہر چہار طرف سے محصور نصب کردہ موحدی فرمانروایان سیاحان یورپ کی زیارت گاہ رہا ہے جس میں متعدد قطعات نارنگی۔ آڑو۔ سیب۔ انگور۔ بادام وغیرہ کے قائم ہیں لیکن سب سے زیادہ بھرمار زیتون کی ہے۔ کہ جس کے لکھو کھا درختوں نے اس کو اچھا خاصہ بن بنا رکھا ہے شاخ تراشی کی طرف کسی کو خیال نہیں۔ صدہا درخت بوجہ کہنگی قابل اخراج ہو گئے ہیں لیکن اس کی پرورش و افزایش کی طرف مسلمانوں کو خیال نہیں۔ مغرب میں زیتون اسی طرح عام ہے جس طرح ہندوستان میں آم اور جس طرح آم کے باغ میں بے فصل جانا بھلا نہیں معلوم ہوتا اسی طرح اجدل میں میرا وقت بری طرح کٹا۔ زیتون جھڑ چکے تھے۔ نارنگی قریب الختم تھی۔ انار لدا ہوا تھا لیکن خام تھا۔ آڑو کی فصل نہ تھی اور نہ سیب کی۔ بادام کے بھی چند تختے تھے لیکن اس وقت یاد نہیں کہ ان کی کیا حالت تھی کیونکہ بیاض میں ان کے متعلق کوئی یادداشت درج نہیں ہے۔

بدقسمتی سے پھول سے یہ باغ بالکل بیگانہ تھا۔ نہ چنبیلی کی کوئی بیل کہیں دکھائی دی اور نہ گلاب کا کوئی تختہ نظر پڑا۔ یہ باغ ایسا ہی بڑا اور غیر دلچسپ تھا جیسا ہزاری باغ کا جنگل یا ملیح آباد کے ۴۔ ۵ باغات کا سلسلہ۔

باغ منارہ یہی کیفیت باغ منارہ کی ہے کہ جسکی تعریف بہت سنی گئی تھی لیکن مجھے ناگپور کے نارنجستان کہیں زیادہ دلکش و آباد و سرسبز معلوم ہوئے۔ البتہ پھولوں کے کچھ تختے ضرور تھے لیکن ہر چہار طرف خودرو گھاس سے یہ رقبہ جنگل ہو گیا تھا۔

شتر مرغ خانہ یہاں غالباً پندرہ سے زائد شتر مرغ نہ تھے۔ فارم غالباً فرانسیسی مہتمم کی بقائے ملازمت و پرورش کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ کیونکہ نہ ملک کو اس کی اس وقت ضرورت ہے اور نہ آیندہ کسی منفعت کی توقع لیکن غیر ملکی حکومت میں ہر جگہ یہی حال ہے۔

اغمات

(منقول از خط موسومہ مکرمی شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب صدر علوم عربی دہلی یونیورسٹی)

ہست ایں دیار یار اگر شاید فرود آرم جمل   پرسم رباب و دعد را حال از رسوم و از طلل

۱۹۳۰ء کی طولانی سیاحت مغرب اقصیٰ۔ مغرب وسطیٰ (الجزائر) مغرب ادنیٰ (افریقیہ۔ تونس) میں نامورانِ اسلام کے مٹے ہوئے نشانات دیکھنے اور فاتحانِ اندلس کے نقش قدم کا کھوج لگانے کے سوا اور کوئی غرض و غایت نہ تھی۔ مغرب اقصیٰ میں علاوہ بربری شجاعت کے مشاہدے کے یہ آرزو بھی تھی کہ شرف العقاب پر اشک فشانی اور مقابر سلا و مراکش و زرہون پر فاتحہ خوانی کے بعد لیکن تلمسان و قیروان جانے سے قبل علامہ ابن الخطیب اور شاہ معتمد کی خواب گاہوں پر یادگاری لوح نصب کروں گا۔ چنانچہ مقبرہ یوسف بن تاشفین سے نکلکر مرابطین کے گشتہ دوم دلفگار و مجروح۔ مظلوم و فراموش کردہ غریب الدیار ابو القاسم بن عباد المعتمد علی اللہ امیر اشبیلیہ اور اس کی باوفا جلیس و شریک رنج و آلام رُمیکیہ المعروف بہ اعتماد و الملقب بہ سیدی کبریٰ کے مقابر پر پھول چڑھانے کے لئے کہ جس کا خواب ۱۹۲۴ء میں القصر اشبیلیہ کی خوابگاہ رُمیکیہ میں

دیکھ چکا تھا قدم بڑھائے۔ میدان جامع الفنا سے گذر کر محکمہ سیر و سیاحت کے دفتر میں پہنچا جسکا منتظم ایک نوعمر ناتجربہ افرنجی لڑکا ہے جس کے متعلق کوئی کہتا تھا کہ کسی بھٹیارہ کے برتن مانجنے پر ملازم تھا لیکن اب قسمت نے سیاحان کی رہبری پر مامور کر دیا ہے۔ اس کی لیاقت و معلومات کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ میرے استفسار پر حیرت و استعجاب سے پوچھنے لگا "اغمات! اغمات! کہاں ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں"۔ میں نے کہا کہ ضلع مراکش کا نقشہ نکالو۔ اس نے ملک مغرب کا نقشہ کھولا جس میں اس قدیم لمتونی المغراوی دارالسلطنت کا کہیں نشان نہ تھا۔ میں نے اپنا بڑا نقشہ نکال کر بتلایا کہ باب اغمات سے نکلکر جنوب و شرقی گوشہ میں شہر مراکش الحمرا سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر یہ غریب برابرہ اور یہودی بقالان کی فراموش کردہ بستی واقعہ ہے۔ مگر اس پر بھی وہ بجز اس کے کہ شانوں کو ہلا کر اور ہونٹوں کو بچکا کر اپنے قومی شعار کا ثبوت دے اور کچھ نہ بولا۔ میں مایوس لوٹا اور باہر موٹر کی تلاش میں کھڑا تھا کہ ایک عرب یا بربری دلّال نے آگھیرا اور پچاس فرانک پر ایک بغلہ کرا کر اغمات جانے کا مشورہ دیا لیکن میں وادی آش (اندلس) اور جبل قاسیون (دمشق) کے سوا کبھی خچر پر سوار نہ ہوا تھا کسی قدر ہچکچایا اور خوف بھی ہوا کہ ۲۰ میل کے غیر آباد اجنبی ملک میں اگر کوئی حادثہ راستہ میں ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔ اس لئے ادھر سے منہ پھیر کر وکٹوریا والے سے بات چیت کی لیکن وہ ایک پونڈ برطانوی سے کم پیچھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتا تھا اور پھر اس میں وقت بھی کافی صرف ہوتا۔ آخر ستری سیارہ ۱½ پونڈ میں طے کر کے جنوب کا رخ کیا۔

شرمندہ ام از آنکہ دریں تعزیت مرا ‌ ‌ ‌ فرصت نہ شد کہ خدمت آں آستاں کنم
امابہ عذر خواہی ایں شعلہ ہائے آہ ‌ ‌ ‌ قندیل وار جانب قبرش رواں کنم

باب اغمات سے نکلتے ہی نیم ریگستانی لق و دق میدان نظر پڑا۔ لیک اور گرڈ واٹ کا نام و نشان نظر نہ آیا کیونکہ بار برداری کے لئے اعرابہ کی جگہ خشکی کے جہاز نے لی ہے۔ جا بجا مگر منتشر کھیت

کپاس اور جوار کے دکھائی دیتے تھے۔ کھجور اور زیتون کے جھنڈ نشیبی علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ گدھو
خچر اور اونٹوں کی قطاریں سامان تجارت سے لدی ہوئی شہر کو آ رہی تھیں۔ ایک سار بان شہنائی بجا رہا ہے
دوسرا لمتونی نغمہ الاپ رہا ہے۔ تیسرا عالم لاپروائی میں ایک ڈنڈا کاندھے پر رکھے مست ہے۔ کوب
پشت پر لٹکا ہوا ہے۔ چندیا پر ایک چھوٹی ٹوپی پڑی ہے شلوار گھٹنے تک اونچی ہے سہم ڈھیلی
ڈھالی جھول کیطرح لٹک رہی ہے۔ گریبان چاک ہے کہنی تک ہاتھ کھلے ہیں۔ گھٹیلا جوتہ پیر سے پھسلا
جا رہا ہے۔ مغراوی شلوحی بچے ڈھیلے ڈھالے جلابیوں کے ساتھ کس صفائی سے اس مینڈ پر
کود رہے ہیں۔ دیکھنا اس نے نالے پر زقند لگائی۔ اور پھر کس سبک جست سے حمار کی پیٹھ پر جا پہنچا
اُن کا کھلتا ہوا رنگ۔ سڈول ہاتھ پاؤں۔ خوشنما خدوخال پاک و صاف معاشرت کی دلیل ہیں
اس ناقہ کو دیکھنا۔ سرخ جھول کے نیچے رنگین گچھے اور لہردار بیل لٹک رہی ہے۔ ناقہ شوخ ہے
اور مست مور کی طرح گردن کوہان سے ملائے۔ حلقہ کئے ہوئے راستہ کے لدو اونٹوں۔ خچروں کو
کترتا کھیتوں کو ناپتا۔ موٹر سے بچتا اپنے خوش رو نوعمر راکب کو لئے ہوئے ہوا ہو رہا ہے۔ یہ ناقہ
مقتنہ کے قائد کا ہے اور اس پر قائد کالڑکا مدرسہ یوسف کے جلسہ کی شرکت کے لئے جا رہا ہے
جہاں آج اس کو انعام ملنے والا ہے اس نالے سے ایک شغدف نما محمل نکل رہا ہے۔ چھت پر
شتر مرغ کے پروں کا تاج ہے یا کسی بیراگی کی ڈولی کا کلس ہے۔ میری موٹر قریب ہوتی ہے
غرفوں سے دو نسوانی شکلیں جھانکتی ہیں۔ شمسی چہروں پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ کلائیاں چوڑیوں
سے لدی ہیں۔ سر پر ریشمی خمار ہیں گلے میں ناد علی اور نقرئی سکوں کے ہار ہیں۔ ان کی نگاہ بیحجابانہ
دوچار ہوتی ہے۔ وہ میری وضع قطع بالخصوص کلپاخ کو گھورتی ہیں۔ ان کی پژمردہ رنگت مخمور
آنکھ۔ ڈھلتی جوانی۔ بیباکانہ تبسم۔ غیر تعارفی سلام پر ہندی سیاح ہنچر رہ جاتا ہے۔ سرزمین تہذیب
میں یہ بے حیائی۔ ملک ملتثمین میں یہ بےپردگی۔ وادی حمرا میں یہ زرد رنگت۔ ساحل دریقہ پر

یہ بے رونقی ۔ میرے استعجاب اور برافروختگی کو دلیل اس طرح بجھاتا ہے کہ یہ آل لغوت کے نونہال
نہیں ہیں نہ ایلان و وریقہ کے گلرو ہیں ۔ یہ نیم خانہ بدوش قبیلہ نائل کی آوارہ گرد عصمت فروش
ڈومنیاں ہیں جو سیاحان جنتہ میمونیہ و مہمانان دارالضیافۃ کی سمع نوازی سے اپنی گذر اوقات
کرتی ہیں ۔ میں اگرچہ طنجہ اور رباط میں ان کے ایک دو افراد کو دیکھ چکا تھا لیکن شان عروسی آج
ہی دیکھنے میں آئی ۔ سر فاسٹر فریزر ممبر پارلیمنٹ و پرائیویٹ سکرٹری وزیر اعظم انگلستان اور نیز
روزیٹا فاربس نے (جو اپنے خطوط میں جو مجھ کو بھیجتی ہیں اپنا نام خدیجہ بنت عبداللہ القہری لکھتی ہیں)
انگلستان میں ان کے دلآویز قصے سنائے تھے ۔ اُن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ میں متحیر
و متاسف تھا کہ اس کمبخت قبیلہ کی ہستی شمال افریقہ میں کیوں باقی ہے ۔ بوسعد کے ٹاب ان کو اپنے
ریتیلے دامن میں کیوں نہیں چھپا لیتے ۔ تطری کے پہاڑ کیوں نہیں شق ہو جاتے کہ یہ ان میں دھنس
جائیں ۔ عبدالمومن کا چابک کہاں ہے کہ ان کی کھال پھوڑ ڈالے ۔ جنرولی کا جلال کیا ہوا کہ ان کو جلا دے
لیکن یہ ایک مجنون کی آشفتہ خیالی ہے کہ زبان سے نکلکر صحرائی مغرب میں منتشر ہو گئی ۔ کوئی ملک
سیہ کاری سے خالی نہیں ۔ یہ ننگ انسان نہ مٹے ہیں نہ مٹیں گے ۔

سلسلہ خیال اسی طرح تانا بانا بن رہا تھا کہ وادی وریقہ کا ساحل آگیا ۔ یہ ایک چھوٹی ندی ہے
جسے ہندوستانی اصطلاح میں نالے سے زائد وقعت حاصل نہ ہوسکے گی ۔ جبل اطلس کا برف گھل گھل کر
بہتا ہے ۔ پانی بہت سرد ۔ صاف اور بقول دلیل صاحب ہاضم ہے ۔ ٹخنوں سے زائد گہری نہیں ہو
موٹر پانی منجھاتی ہوئی دوسری طرف نکلی ۔ سامنے اغمات ایلان کے خام مکان اور مکانات سے
زائد ویران کھنڈر نظر پڑے ۔ موٹر کھیتوں اور باڑیوں کا چکر لگاتی ہوئی آبادی کے کنارہ ایک
زاویہ کے قریب کہ جس کا باغیچہ سرخ اناروں سے لدا ہوا تھا رُکی ۔ دلیل نے پھاٹک کھولا ۔ میں
اترا ۔ گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے ۔ زاویہ سے ایک پیر فرتوت جن کی نورانی صورت بسفید صوفی لباس

سفید پنبئی ریش دیگر دہقانیوں سے ان کو ممتاز کیے ہوئے تھی برآمد ہوئے۔ سلام علیک کے بعد مصافحہ
اور مصافحہ کے بعد رسمی گفتگو ہوئی۔ میں نے اپنے آنے کی وجہ بتائی جس کے جواب میں یہ ارشاد
ہوا کہ یہاں بہت سے سلاطین پیوند خاک ہیں لیکن کسی کا نام و نشان باقی نہیں۔ اس کے بعد انھوں
نے استحصال بالجبر یا استحصال بالرضا کے لئے روضہ کے اندر آنے کی دعوت دی۔ حضرت عبداللہ
ابن میمون کا یہ مزار ہے۔ قبر خام ہے اور غیر آراستہ۔ میرے داخلہ پر بخور سلگایا گیا۔ میں نے
فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ مزور صاحب نے چند انار مرقد مبارک سے مس کر کے مرحمت فرمائے
پھر ان کو ساتھ لے کر قدیم ویران شکستہ قبرستان میں جو گاؤں سے ہٹ کر ایک پزادہ کے قریب
ہے گیا۔ کوئی قبر سلامت نہیں۔ ہر طرف ملبہ سا جما ہوا ہے۔ انجیر۔ انگور۔ زیتون۔ کارک۔ سیب
نارنگی کے درخت خودرو اُگے ہوئے ہیں کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں دامن نوچتی ہیں۔ میں نے
پتہ تبلایا کہ معتمد کی قبر تالاب کے پاس ہونا چاہیئے لیکن تالاب ایک نہیں بلکہ تین ہیں اور تینوں
کنول سے گلزار بنے ہوئے ہیں۔ پانی کہیں کم کہیں زیادہ۔ قبروں کے ڈھیر جابجا موجود ہیں لیکن
نہ کوئی کتبہ ہے نہ لوح مزار۔ اونچے ڈھیر سے گمان ہوتا ہے کہ یہاں قبر ہوگی۔ آخر انھوں نے
تھک کر مدرسہ کے مولوی صاحب احمد تادلی کو طلب فرمایا جنھوں نے آتے ہی یہ کہکر کہ یہاں
کوئی بادشاہ اس نام کا مدفون نہیں ہے۔ خرمن آرزو پر اوس ڈالدی۔ فرمایا کہ معتمد کی قبر جامع
یوسف میں ڈھونڈو ورنہ شلہ میں اور اگر وہاں بھی نہ ملے تو انچکار میں ملجائے گی۔ میں نے عرض
کیا کہ معاف کیجیے۔ اشبیلیہ کا تاجدار اپنی ملکہ کے ساتھ اسی خاک میں سو رہا ہے۔

غرضکہ تالابوں کا چکر لگانا شروع کیا۔ آگے آگے وکیل صاحب اور مزور صاحب اور پیچھے پیچھے
میں۔ راستہ خراب اور پیچیدہ تھا۔ میں بچ بچ کر چلتا تھا اور اس غریب الدیار کا مدفن باچشم تر
ڈھونڈتا جاتا تھا۔ کبھی اس ڈھیر پر گمان ہوتا تھا اور کبھی اُس پر۔ اُس سایہ دار زیتون کے نیچے

شاید رُمیکیہ محو خواب ہے۔ اُس تودہ خاک میں یقیناً اُس ناکام حسرت کی ہڈیاں مدفون ہیں جس نے آخری زمانہ جلا وطنی میں کاٹ کر اپنا دم زنداں اغمات میں توڑا۔ شاید تالاب کی چادر آبی نے اس کو آغوش رحمت میں دبا لیا ہے کیونکہ اس نے اپنی تربت کو باران رحمت سے ہمیشہ سیراب ہونے کی دعا بارگاہ ایزدی سے مانگی تھی۔ وہ کنول شاید اسی کی گمنام لحد آبی کے بار بنے ہوئے ہیں ہنس اسی کی تفریح کے لئے جھوم رہے ہیں۔ وہ سامنے کے چکور اعتماد کی کبک خرامی کی نقل اتار رہے ہیں۔ درختوں کی قمریاں اسی کی یاد میں زمزمہ سنج ہیں معتمد! معتمد! تو کہاں ہے۔ ایک غریب ہندی سیاح کی طرف گوشہ چشم کر جو تیری قبر پر پھول چڑھانے آیا ہے۔ جو تیرے وطن۔ تیری کھوئی ہوئی دار السلطنت۔ تیرے غیر آباد القصر میں تیری عظمت و جلال کا نقشہ دیکھ آیا ہے جو تیری سخاوت۔ تیری دریا دلی۔ تیری مہماں نوازی کا غلغلہ اشبیلیہ کی گلی گلی میں سن چکا ہے جو تیرے قصائد کے خیالات نادرہ۔ تیری غزلیات کی ندرت۔ تیری نوحہ جات کی سوز و گداز۔ تیری مکاتیب کی انشائے لطیف سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے۔ میں نہ ابن اللبانہ ہوں اور نہ عبد العزیز۔ نہ ابو العلا کے مراتب کا طالب اور نہ ابن عمار کی بلند پروازی کا متمنی۔ حُصری کی طرح مفلوک الحال ضرور ہوں لیکن حرص و ہوس سے دور۔ تیری ہی بارگاہ کا دریوزہ گر اور تیرے ہی عشق کا اندھا۔ اے وہ نامراد جس نے حالت اسیری میں کبھی سائل کا سوال رد نہیں کیا جس نے فاقہ کشی میں اپنے بدن کی چادر تک اتار کر دینے میں تامل نہ کیا۔ جس کی ناز پروردہ سیدہ کبریٰ نے سوت کات کات کر ہر راہ گیر کو گرہ گیر الفت کر لیا ہو۔ اے معتمد تجھے اپنے علم و فضل کی قسم۔ اپنی وسیع زرخیز برباد شدہ سلطنت کی سوگند۔ اپنے لخت جگر فخر الدولہ کی خودداری کا واسطہ جس نے زرگری کے مقابلہ میں صواغی کو ترجیح دی۔ اپنی قرۃ العین ثمینیہ کی عطرت و عفت کا صدقہ اعتماد کے حسن لاجواب اور سب سے زیادہ اس کی وفاداری اور ثابت قدمی کے طفیل میں اس سیہ رو ہندی کے تاریک

قلب کو اپنے جمال جہاں آرا سے منور کر۔ وہ تیری قدمبوسی کو راہ بعید سے آیا ہے۔ اس کے سر پر برکت کا ہاتھ رکھ اور اپنے خزانہ علوم و فنون سے اس کی جھولی بھر۔ خدارا اپنی آرامگاہ کا پتہ دے کہ تیری بالیں پر تیرا تصنیف کردہ آخری مرثیہ لوح پر کندہ کرا کر اپنی دیرینہ آرزو پوری کرے۔ لیکن شورہ بخت ولی محمد کی نارسائی کہ گنبد آرزو عین منزل مقصود پر شکست ہو کر دائمی حسرت و اندوہ میں منقلب ہو گئی۔ معتمد تاجدار اور اعتماد ملکہ اشبیلیہ کے مزارات کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ہیں کہ ہمہ شوق۔ ہمہ آرزو مراکش الحمرا سے نکلا تھا ہمہ حرماں ہمہ حسرت و اندوہ اغمات سے واپس چلا۔

اگر پرسند سعد از عشق او حاصل چہا کردی؟ ملامت ہائے گوناگوں جراحتہائے بے مرہم

دمنات

(منقول از خط موسومہ کپتان محمد کرامت اے ڈی سی اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال)

ایک روز الجلوی باشا کے یہاں جب چاء پر مدعو تھا تو باشا نے فرمایا کہ اگر فرصت ہو تو دمنات میں شکار کھیلو۔ میں نے جواب دیا کہ شکار کا مطلق شوق نہیں اور اگر ہوتا بھی تو اس قلیل مدت میں کیونکر کھیل سکتا تھا۔ میں تو صرف تاریخی مقامات دیکھنے کو آیا ہوں اور بس۔ اس پر فرمایا کہ پھر کہف الارنی کے غار کسی جمعہ کو آ کر دیکھو۔ میں وہاں جمعرات کو جا رہا ہوں۔ اگر جی چاہے تو میری ساتھ چل سکتے ہو۔

خیر دمنات میں تو شکار نہ کھیل سکا لیکن شکار کھیلنے والوں کا ساتھ دوسرے ہی دن دیا یعنی باشا کے فرزند اکبر صبح کو ہرن کا شکار نیزہ سے کرنے کے لئے جانے والے تھے اور میں نے کبھی ہرن کو برچھی سے مارتے نہیں دیکھا اس لئے صبح کو بیرون شہر شکار کو چلے۔ طلوع آفتاب سے کچھ قبل باب احمر سے نکل کر تین چار میل تک موٹر پر گئے ہوں گے کہ شکارگاہ آ گئی۔ یہاں ہمیں بائیں خچر اور

اسی قدر عرب و دیسی ٹٹو موجود تھے۔ خچروں پر ملازمین شکار گھیرنے کو آگے چلے مثل قراول اور ہم لوگ گھوڑوں پر بکھرے ہوئے آگے بڑھے کہ ایک نشیبی میدان میں ایک غول چکاروں کا نظر پڑا۔ ہم نے اور نیز ملازمین نے کہ جو دور پر حلقہ کی شکل میں جا رہے تھے ان کو گھیرنا شروع کیا۔ علاقہ میدانی اور بھوڑ کا تھا۔ آدھ میل تک بڑھے ہوں گے کہ حلقہ تین چار چوگانوں کے برابر محدود ہو گیا ہو گا۔ اس وقت صالح۔ ذکی۔ جلوی وغیرہ نے گھوڑے تیز کیے۔ بلم سنبھالے اور اک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔ دھاوا اس قدر تیز تھا کہ چکارے چوکڑی بھول گئے۔ کبھی آگے زقند لگاتے اور کبھی دائیں بائیں آخر صالح نے ایک کو بلم سے چھید ہی لیا دو اور چکارے بھی اسی طرح شکار ہوئے۔ ایک چکارے کے پیٹ سے بلم لٹک گیا۔ خون کا فوارہ جاری ہو گیا لیکن چکارا پھر بھی ہوا کی طرح اڑ رہا تھا لیکن تیس چالیس آدمیوں کے حلقہ سے باہر نکلنا محال تھا۔ آخر کسی نے لپک کر دوسرا بلم چھید دیا اور وہ غریب مصلوب ہو کر زمین پر گر پڑا۔ شکاریوں نے اتر کر ذبح کیا اور خچروں پر لاد کر گھر لائے۔

میں نے سور کا شکار بلم سے راجپوتانہ میں دیکھا تھا اور مور کا شکار بھی اس طرح ہوتے ہوئے سنا تھا لیکن ہرن و چکارہ کا شکار نیزہ سے نہیں دیکھا۔

غالباً اس شکار میں تین چار گھنٹے لگے ہوں گے۔

الصویرہ

Mogador

میرا ارادہ الصویرہ جانے کا مطلق نہ تھا اور نہ یہ ساحلی شہر میرے پروگرام میں تھا لیکن مراکش میں فرانسیسی افسران و منتظمین محکمہ سیاحت نے اس کے گوناگوں اوصاف میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ مجھے ایک دن اس کے لیے نکالنا ہی پڑا۔ اور براہ سیدی عیبنان مشہور بوجہ قالین بافی، شیشوا، عنق الجمل۔ سیدی مختار۔ عین تفن تشت۔ سوق الطلبعہ۔ سیدی طلعہ

تقریباً سوا سو میل کی خوش سواد دلفریب مسافت جس میں ارجان کے جنگل نے لطافت و تازگی پیدا کر دی تھی چار گھنٹہ میں طے کر کے پری تمثال و تصویر نما شہر الصویرہ کے نقش و نگار مطالعہ کرنے لگا۔ میری موٹر میں چار دیگر سیاح بھی تھے جس میں سے ایک انگریز سیاح کی نشست میری قریب تھی جس کی وجہ سے راستہ خوش گپیوں میں اچھی طرح کٹ گیا۔ انگریز نے اپنی ہمہ دانی کے زعم میں ارشاد فرمایا کہ اس شہر کا نام تصویر سے نکلا ہے اور چونکہ حضرت سلامت ایران کے کارخانہ تیل میں کچھ دن رہ آئے تھے اس لئے صورت رتصویر۔ صویرہ کو ہمشکل بتلاتے تھے لیکن ہوٹل روسیلان کے عرب دبّیل نے اس تاویل پر مسکرا کر مطلع کیا کہ اس شہر کا نام اس کی عریض و مستحکم فصیل سے الصویرہ رکھا گیا ہے اور یہی بات صحیح بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مغرب اقصیٰ کے کسی شہر کی فصیل اتنی چوڑی۔ بلند اور مستحکم نہیں ہے۔ بلکہ میرے علم میں تو جے پور اور کوٹا کی فصیلیں بھی اتنی دبیز نہ ہوں گی۔ بہرحال وجہ تسمیہ خواہ کچھ بھی ہو اس وقت فرانسیسی اثر سے اس شہر کا نام موگوڈور پڑ گیا ہے جس کی علت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت سیدی مگدول کہ جن کا روضۂ مبارک اسی شہر کے کنارے وادی قصب پر نظر آتا ہے یہاں کے قطب الاقطاب ہیں اور انہیں کے نام نامی پر اس کا نام پڑ گیا بعض نصاریٰ کا خیال ہے کہ مگدول کوئی نصرانی شخص تھے لیکن یہ غلط ہے۔

بہرحال تسمیہ کی بحث چھوڑ کر اس داستان حسن و عشق کو آشفتہ حال نازک خیال شاہد پرست دلچسپی سے سنیں گے کہ بعہد ملکہ الزبیتھ انگلستان کا ایک بیڑہ جہازات اس غرض سے نکلا کہ جہاں کہیں کوئی قطعہ زمین لاوارثی نظر پڑے اس کو ملکہ انگلستان کے نام پر غصب کر لیا جائے۔ اس بیڑے کا سپہ سالار اعظم ڈریک نامی مشہور ملاح تھا۔ بیڑہ کا گذر ادھر ہوا اور الصویرہ کے پاس جو چند جزیرے تھے ان میں سے ایک پر لنگر انداز ہوا۔ ایک جہاز پر چند نوخیز پری جمال لڑکے

بھی تھے جن کو دیکھکر بد چلن مسلمان حبشیوں نے مرگ مفاجات کو لبیک کہنا شروع کیا۔ ظاہرا نظارہ بازی اور دیدہ بوسی سے نیت جب نہ بھری تو ایک روز موقعہ پاکر مغرب اقصی کا ایک کالا دیو انگریزی گلفام کو لے اڑا۔ لڑکے کا غائب ہونا تھا کہ جہاز پر دہائی تہائی مچ گئی۔ ڈریک نے بہت کوشش کی اور آخر سلطانی عمال نے اس طفل پریزاد کو اوباشوں سے چھوڑا کر واپس پہنچا دیا

ساحل صویرہ سے ملے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں جن میں سب سے بڑا جزیرہ جو ایک میل سے زائد لانبا نہ ہوگا اس ملک کا "جزیرہ کامران" مخصوص برائے قرنطینہ حجاج بیت الحرام ہے لیکن میں نے اس کی زیارت کا احرام قرنطینہ کی نیت سے نہیں باندھا تھا بلکہ قصہ مذکورہ بالا کے سلسلہ میں جو میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا اور یہ دیکھنا چاہا کہ انگلشیہ آہن پوش "حرم" مغربی دست درازی سے کس طرح فریاد کرنے لگا تھا۔

اس شہر کو سیدی محمد بن عبد اللہ نے ۱۷۶۵ء میں ایک ایسے صاف و نفیس مقام پر آباد کیا کہ جو بروئے تحقیقات لطافت آب وہوا۔ مناظر قدرت ساحل اطلانتک پر جواب نہیں رکھتا فرانسیسی شفاخانہ کے ڈاکٹر نے وثوق کے ساتھ مجھ سے بیان کیا کہ یہاں کی آب وہوا امراض سینہ کے لئے نہایت ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔ شہر کا موقعہ بہت اچھا ہے۔ ایک طرف بحر اطلانتک ہوا کو تازگی بخشتا رہتا ہے اور دوسری طرف ریت کا دشت نا متناہی تمام رطوبات کو جذب کرتا رہتا ہے۔ شمال میں شیاذمہ کا زرخیز علاقہ ہے اور جنوب میں حاحہ کا پرگنہ۔ خرابی اگر ہے تو یہ کہ آندھیاں بہت آتی ہیں۔ ہوا ہر وقت تیز چلتی رہتی ہے اور ریت اڑ اڑ کر ہر چیز پر گرتی رہتی ہے۔

شفاخانہ قابل دید ہے۔ میرے گھٹنے میں بوجہ سردی اور بادیہ پیمائی پہلی مرتبہ رچمنڈ کے برف خانہ میں اور پھر رباط میں اور وہاں سے چل کر مراکش میں درد ہونے لگا تھا۔ اس لئے

یہاں آنے میں یہ غرض بھی شامل تھی کہ شفاخانہ کے کسی ڈاکٹر سے رجوع کروں گا چنانچہ ہوٹل میں سامان رکھنے اور کھانے کے بعد جب سیر کو نکلا تو شفاخانہ کو بھی دیکھا۔ اگرچہ بیشتر اطبا جاچکے تھے اور کمرہ ہائے مطب خالی تھے لیکن ڈاکٹر موجود الوقت نے جس دلجوئی و توجہ سے میرا حال دریافت کیا اس کا اثر میرے دل پر اس وقت تک قائم ہے۔ زاں بعد میرے استفسار پر اسپتال کے متعدد کمرے۔ دارالاقامہ۔ کمرہ شعاع شمسی وغیرہ دکھلائے۔ اس کو افسوس تھا کہ جنوب فرانس و اطالیہ کے مریضان دق بجائے مصر جانے کے یہاں نہیں آتے۔ پھر خود ہی جواب دیدیا کہ "سامان تعیش" کی عدم موجودگی سے یہ شہر مشہور نہ ہو سکا اور جب تک "جنس لطیف" لباس عریاں اور تفریح روح کے اسباب فراہم نہ ہو جائیں گے اس وقت تک کوئی شہر مرکز سیاحان نہ ہو سکے گا۔

شہر بہت صاف ستھرا ہے۔ شوارع حدادو مشور بہت فراخ کشادہ اور آباد ہیں۔ لکڑی کا کام بہت اچھا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی میزیں۔ رحلیں۔ کرسیاں۔ صندوقچہ۔ الماریاں وغیرہ بہت خوبصورت بنتی ہیں جن پر نگینہ اور کشمیر کی دستکاری کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ظروف گلی کے لئے بھی یہ جگہ مشہور تھی لیکن جس طرح امروہہ۔ مرزاپور لکھنؤ کو جاپانی کمہاروں نے زک دیدی ہے اسی طرح فرانسیسی صناعی کے سامنے ان کا چراغ گل ہو رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس شہر کی تعمیر میں یورپ کے کاری گروں اور معماروں نے بھی کام کیا تھا اور انگریزوں نے بھی جبل الطارق کے ایک انجینیر کو یہاں کام کے لئے . . . بھیجا تھا لیکن نکما ثابت ہونے پر بھگا دیا گیا۔ سفاقہ کی تعمیر میں اطالوی ماہرین عمارت نے بہت کچھ مدد دی تھی۔ اس مقام سے سمندر کا منظر بہت دلکش نظر آتا ہے اور اگر کوئی صاحب اس شہر کو تشریف لے جائیں تو شام کے وقت ایک گھنٹہ اس دمدمہ پر ضرور گذاریں۔

اسفی

(منقول از خط موسومہ برادر عزیز منشی غنی محمد اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم جنت آشیاں)

اندوہ و مسرت۔ رنج و انبساط غصہ و شادمانی کی متضاد بارگراں سے دل چور چور تھا جب بندرگاہ اسفی کی عدوہ رباط کی زاویہ سیدی ابو محمد صالح کے قریب سے ہوتی ہوئی میری موٹر سوق التجارت کے وسط میں پہنچکر ہوٹل سنتزال کے دروازے پر ٹھیک اس وقت کہ جامع مسجد سے نقیب اسلام حی علی الصلوٰۃ کی بانگ سے مجاہدین حق کو بُلا رہا تھا رُکی۔ دل نے کہا کہ ایک وقت تھا کہ اللہ اکبر کا نعرہ فتح و نصرت کی نوید لایا کرتا تھا اور آج یہ حال ہے کہ لا الہ اللہ کی آواز پر افسردگی چھا جاتی ہے۔ ایک وہ شہر رباط الفتح تھا جس کی تعمیر فاتحان اندلس کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی اور ایک یہ شہر ہے کہ جس کا حلقہ رباط خارج البلد و جلا وطن اندلسی مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔ الصویرہ سے آتے ہوئے رباط کی چوکڑی پہلے پڑتی ہے جس کے کشادہ حسین خوش سلیقہ بازار میں جہاں بیشتر فرانسیسی اور چند عربی دوکانیں آباد ہیں اگر میرا بس چلتا تو اتر پڑتا لیکن خیر سوق التجارت کے صدہا بلکہ ہزارہا سفید عمامہ۔ سفید کفتان اور سفید برانس نے اس کی تلافی کردی اور تھوڑی دیر کے لئے میں بالکل بھول گیا کہ کلکتہ کی طرح فرانس نے اس ملک میں جس جگہ سے پیشقدمی شروع کی تھی اور اپنا اولین سفیر دربار خلافت میں جہاں مقرر کر کے بھیجا تھا اُس کے ایک مسافر نواز ہوٹل میں میں اپنا سامان کھول رہا ہوں۔ اس وقت اسفی مغربی حصہ ملک کا مشہور بندرگاہ تھا لیکن اب متعدد بندرگاہ کھُل گئے ہیں اور اسفی کی عظمت بحیثیت بندرگاہ اسی طرح گر گئی ہے جس طرح شہر سورت کی بمبئی کے سامنے۔ فرانس نے ملک مغرب پر جس طرح چھاپہ مارا اور جس طرح عربی آبادی کی عربی تہذیب۔ عربی عزم و تہور۔ عربی بسالت و شجاعت

عربی علوم وفنون یورپی دارو گیر کے سامنے تباہ ہو رہے ہیں ان کے منازل تنزل کے مشاہدے نے ہر جگہ خون کے آنسو رلائے۔ لیکن اسفی میں اس خیال سے کہ دشمن نے اسی شہر سے چال بازیاں شروع کی تھیں دل پاش پاش ہو گیا۔ اندلسی باشندگان رباط کے خوبصورت مکانات۔ بچوں کے حسین خط وخال۔ بوڑھوں کے اخلاق جمیلہ دیکھکر فرط شوق سے آنسو بھر آئے۔ تطاوین اور سلا کے بعد مجھے یہ چھوٹا شہر اندلسی نقطۂ نظر سے بہت کچھ پسند آیا۔ اس کا وسیع بازار۔ خوبصورت مساجد رنگین قرمید کے اجارے۔ مصفا حوض وسقایا سے دل باغ باغ تھا۔ قصر محمد بن عبداللہ پر غرناطہ کے کسی محل کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ذکریا بن احمد الخضری کا باغیچہ جہاں انھوں نے مجھ کو محض ایک ہندی مسافر سمجھ کر قہوہ پلایا تھا کس قدر فرحت بخش ہے رجبل البیاض میں پاشا کی کوٹھی کا رد کار تقصر اشبیلیہ کو مات کرتا ہے۔ بارہ دری کی محرابیں تو شاید الحمرا سے اکھاڑ کر نصب کر دی گئی ہیں اور باغ میں تو سرخ لالہ کے تختوں نے آگ لگا رکھی ہے۔

وقت کم تھا اور ارمان بہت کھانے کے بعد سیر کو جو نکلا تو آٹھ بجے تک اس کے باغ وراغ۔ بازار و گلی کوچہ قلعہ وقشلہ۔ دار البارود و دار البحر۔ ربض رباط و بیاض۔ ڈاکخانہ اور بنک۔ ملاح اور معسکر میں محو رہا۔ دار البحر کی ایک اسپانوی برنجی توپ پر بیٹھ کر غروب آفتاب کا منظر دیکھکر جب سید ابو محمد صالح کے روضہ پر گیا تو وہاں اچھا خاصہ مجمع تھا۔ یہ حرم بیکسوں کا ملجا وماوا ہے اور عہد اسلامی میں جس کسی نے اس میں پناہ لی وہ عدالتی حاضری سے معاف ہو گیا لیکن اب فرانسیسی سمن کی دارو گیر نے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا۔

درگاہ کے ایک گوشہ میں زیادہ ہجوم تھا جس کے متعلق رہبر نے بیان کیا کہ احمد غبریت کی تربت پر اس کی بیوہ شمع اور پھول چڑھانے آئی ہے۔ بقول رہبر جنگ ریف میں احمد غبریت کو جبکہ وہ تطاوین میں اپنے اعزا کے پاس ملاقات کے لئے گیا ہوا تھا اسپانوی سپاہ نے جبراً بھرتی کر لیا اور

قواعد وغیرہ کی تعلیم کے بعد ایک شفاخانہ فوجی کے ساتھ جو ملیلیہ جارہا تھا متعین کر دیا۔ جزیرۃ النکور پر جس وقت کہ ملازمین شفاخانہ اتر رہے تھے عبدالکریم ریفی کی توپ کا ایک گولہ پڑا جس سے چند آدمی مجروح اور دو غرق ہو گئے۔ کشتی لوٹی تو کئی خادمات اسپتال بھی ڈبکیاں کھانے لگیں۔ احمد نے کہ شناوری میں ید طولی رکھتا تھا سب کو نکالا۔ ان میں ایک نوجوان امیرزادی اینتہ نامی بھی تھی جس کا باپ قصبہ الطاف اللہ واقعہ پرگنہ طرکونہ کا مالدار نصرانی زمیندار تھا۔ احمد کی نوکری اسی اسپتال صلیب احمر پر تھی کہ جس میں اینتہ نرس کی خدمت اعزازی پر متعین تھی۔ ان دونوں میں محبت ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے عشق کے درجہ پر پہنچ گئی۔ معرکہ تفاح میں جب احمد اسبالنوی مجروحین کو لئے جارہا تھا تو ریفی گولہ سے مجروح ہوا اور اسی اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ جہاں اینتہ کی تیمارداری نے اسے جلد صحت یاب کر دیا۔ احمد جب فوجی خدمت سے سبکدوش ہوا تو اینتہ بھی اپنی والدین کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ ہولی جہاں یہ دونوں چار سال تک خوش وخرم رہے لیکن سال گذشتہ احمد نے بعارضہ ہیضہ دو لڑکے چھوڑ کر انتقال کیا اور اینتہ کو داغ بیوگی دے گیا اینتہ جو مشرف باسلام ہو گئی تھی اور جس کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا تھا۔ تھوڑی بہت تعلیم یافتہ اور علاج معالجہ سے واقف کار تھی اس لئے عرب خاندانوں میں طبابت کر کے اپنی شکم پری کرتی ہے۔ اسبانیہ سے قلیل گذارہ بھی ملتا ہے۔ گھر میں تھوڑی سی جائداد موروثی بھی ہے جو گذر اوقات کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ آج شام کو یہی اینتہ اندلسی جسے عائشہ سفیوی کہنا زیادہ زیبا ہوگا۔ اس وقت اپنے دونوں بچوں کو لے کر شمع چڑھانے آئی ہے۔ سر سے پاؤں تک سفید برقعہ میں ملفوف ہے جو اس قدر نیچا ہے کہ پیر بھی باہر نظر نہیں آتے۔ صرف دو آنکھیں جالی کے جھروکہ سے سامنے کی چیز کو دیکھتی ہیں اور بس۔ اندلسی نصرانیہ اور اس قدر پردہ کا لحاظ! یورپی خاتون اور اس قدر شوہر پرست! دنیادار اور زر پرست ہو کر اس قدر خوش اعتقادی! مگر یہ سارے

کرشمہ اسلام اور مغرب اقصیٰ کے ہیں۔

اسفی العذرا میں ایک مستحکم قلعہ از نام قشلہ قابل دید ہے جس کو پرتگال نے تعمیر کیا تھا اور جس کے بعض مکانات کی آرائش میں پرتگال کے عربوں کو قبل اس کے کہ وہ جلاوطن کئے جائیں بلاکر کام پر لگایا تھا۔

دارالبحر کا منظر بہت اچھا ہے اور مغرب اقصیٰ کی سطوت وجبروت کا اندازہ کرنے کے لئے اُن متعدد توپوں کا مشاہدہ کافی ہے جو ہالینڈ۔ ڈنمارک۔ اندلس نے نذر کی تھیں اور جو یہاں منتشر پڑی ہیں۔

الجدیدہ

Mazagon

اسفی سے دس بجے موٹر روانہ ہوئی اور سوق الطلعة، سوق الجمعة سہیم، سوق الاربعة، سوق الخمیس سے گذرتی ہوئی سیدی سمعین میں ذرا دیر کے لئے رُکی جہاں ایک زراعتی مدرسہ ہے اور پھر وہاں سے چل کر براہ سیدی ابراہیم۔ دار بن عباس الحمادی۔ شہر الجدیدہ کو تقریباً ایک بجے پہنچی اور شارع شارلہ کے شاندار اطلانتک ہوٹل میں شب باشی کے لئے نہیں بلکہ کھانا کھانے کے لئے اترا۔ ہاتھ منہ دھو کر لنچ کھایا اور پھر ایک ٹکسی میں ہوٹل کے رہبر کو لے کر سیر کو نکلا۔

الجدیدہ ساحل سمندر پر واقع ہے۔ زمانہ ماضی میں جب اس کی حیثیت ایک قریہ سے زائد نہ تھی پرتگال نے ملک مغرب کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ یہاں نہ کوئی فوج رہتی تھی اور نہ آبادی زائد تھی۔ اس کے بعد تحفظ کے لئے ایک گڑھی کی تعمیر شروع کردی۔ چنانچہ اس کی مناسبت سے اس مقام کا نام "البرجیہ" پڑ گیا۔ یہ

واقعہ ۱۵۰۲ء کا ہے کہ جب خاندان لودھی کا دوسرا فرمانروا اسکندر اپنا مستقر دہلی سے آگرہ میں منتقل کرنے کی فکر میں تھا اور غرناطہ سے مسلمانوں کو نکلے ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔

جب حکومت نے قبائل بربر کو اس شہر کی بازیافت کے لئے مامور کیا تو انھوں نے دو مقام پر ناکہ بندی کی اور وہ دونوں مقام انہیں قبائل کے نام پر پڑ گئے ہیں یعنی "فحص اولاد ذویب" اور "فحص الزموری" پھر مجاہد اعظم حضرت سیدی محمد العیاشی کی قیادت میں تسخیر کے لئے کوشش کی گئی لیکن فتح کا سہرا سیدی محمد بن عبداللہ کے سر رہا جن کی سخت یورش کے سامنے نصاریٰ نوک دم فرار ہونے کے لئے طیار ہو گئے لیکن مسلمان جنرل نے منادی کرادی کہ دشمن اپنا کل مال و متاع اپنے ساتھ لیجا سکتا ہے چنانچہ تمام باشندے زن و مرد۔ بوڑھے بچے باطمینان تمام روانہ ہوئے لیکن چلتے وقت اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہ رہے یعنی کل بے زبان مویشی۔ گھوڑے۔ خچر۔ گدھے۔ بیل گائے۔ بکری۔ بھیڑ ہلاک کر کے سامان غیر منقولہ میں آگ لگادی۔ مکانات منہدم کر ڈالی اور قلعہ میں سرنگیں لگاتے گئے۔ اس طرح "البرجیہ" تباہ برباد ہو گیا جس پر عرب اس کو "مہدومہ" کہنے لگے۔ یہ واقعہ رمضان المبارک ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۷۶۹ء عہد شاہ عالم بادشاہ دہلی جنگ بکسر سے پانچ سال بعد کا ہے۔ شہر اوسط درجہ کا ہے لیکن چھ سات سڑکیں بہت کشادہ ہیں اور دوکانیں بھی اچھی خاصی بن گئی ہیں۔ سمندر کا منظر دلفریب ہے اور نہانے کی ریتیلی گھاٹ بہت محفوظ ہیں۔ لیکن حسن عریاں کی وہ بجلیاں جو یورپی ساحل پر گرتی ہیں یہاں مفقود ہیں شہر میں دیکھنے کی چیز صرف ایک سقایا ہے جو قسطنطنیہ مرحوم کے سقایا سے ملتی جلتی ہے۔ ایک فارم نسل کشی بھیڑ کا بھی ہے جہاں میں نے ایک گھنٹہ گذارا۔ بھیڑ اور دُنبہ انگورہ کے جانوروں سے ملتے جلتے ہیں لیکن انکی

پشم اتنی ملائم۔ دراز۔ باریک اور مضبوط نہیں ہوتی۔ فارم کی نگہداشت پر دو فرانسیسی افسر متعین ہیں چرواہے کی خدمت مسلمان کی قسمت میں لکھی ہے۔ چولانبا ڈنڈا لئے پاسبانی کررہا ہے۔ سر پر لال ٹوپی بلا پھندنے کی رکھی ہے۔ پیر میں گھٹیلا جوتہ۔ بدن پر ایک لانبا کرتہ بلا شلوار کے پڑا ہے اور وہ اس حال میں مگن ہے کہ مہینہ پیچھے چند فرانک سی اس کی مٹھی گرم ہو جاتی ہے۔ فرانسیسیوں نے الجزائر میں متعدد فارم قائم کر رکھے ہیں۔ اور اونی پارچہ و کمبل بافی کا کام بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے جن کا ذکر سیاحت الجزائر کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔

ازّمور

میرا مطلق ارادہ ازمور جانے کا نہ تھا لیکن اطلانتک ہوٹل کے جمعدار نے یہ سن کر کہ مجھ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی ہے صلاح دی کہ دو گھنٹہ اس خالص اسلامی شہر کے لئے ضرور نکال لیجئے۔ الجدیدہ سے اس کا فاصلہ دس گیارہ میل سے زائد نہیں ہے۔ اس لئے پانچ بجے سہ پہر کو ایک ٹکسی پر جس پر دو اور مسافر ہوٹل کے مل گئے ہیں روانہ ہو گیا اور براہ سیدی علی۔ سیدی حمید۔ دارمن منا۔ اس "زیتون صحرائی" کی (کیونکہ جنگلی زیتون کو بربری پراگرت میں "ازمور" کہتے ہیں) خوشہ چینی میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کے صاف راستے۔ پاکیزہ آب و ہوا۔ باشندگان کا سفید بے داغ عربی لباس مساجد کی رونق اس کو دوسرے ہمسر شہروں سے ممتاز کرتی ہے۔ شوفر صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ اس شہر میں نہ کوئی ڈاڑھی منڈا نظر آئے گا نہ نصرانی ہیٹ دیکھنے میں آئیگی اور نہ کوٹ پتلون کسی کے جسم پر نظر آئے گا۔ اور واقعی اس قصبہ کی چند گلیوں میں جہاں

میں پیدل گیا اور چند سڑکوں پر جہاں موٹر چکر لگا سکی کہیں یورپی معاشرت کا نشان دیکھنے میں نہ آیا۔ اس کے علاوہ میں نے دو گھنٹہ کی سیاحت میں کسی عورت کو بھی نہیں دیکھا گلیوں میں گول چکنے پتھروں کا کھرنجہ ہے جن کو ام الربیع کی تیز دھار نے لڑھکا لڑھکا کر چکنا کر دیا ہے۔ آب و ہوا خوشگوار ہے جو باشندگان کی مضبوط دست و بازو اور سرخ سپید رنگت کی ذمہ دار ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ ام الربیع کا پانی مثل دریائے نیل کے پانی کے بہت ہاضم ہے۔ اس تعریف میں شاید کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن بحر اطلانتک کے قرب سے ہاضمہ کو ضرور تقویت پہنچتی ہوگی۔

شہر میں جا بجا سنگین گوبے دکھائی دیتے ہیں اور ساحل کے قریب زنگ خوردہ توپیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ مغرب اقصیٰ پر نصاریٰ کا دانت عرصہ سے لگا ہوا تھا اور بالآخر فرانس ہضم کر گیا۔

یہاں کے قطب الاقطاب حضرت سیدی بن شعیب کا مزار بیرون شہر واقع ہے جہاں رواروی میں میں نے بھی حاضری کی سعادت حاصل کی۔ معتقدین کا خیال ہے کہ حضرت موصوف کی دعا کی وجہ سے یہ مقام ابھی تک مغربی آلائش (میخانہ۔ قمار خانہ۔ چکلہ۔ بے دینی) سے مبرا و منزہ ہے لیکن دنیا تو اس وقت جانے کہ جب اس ملک پر پھر خالص اسلامی حکومت ہو جائے۔

Meknes

مکناسۃ الزیتون

(منقول از خط موسومہ عزیزی ڈاکٹر جگل کشور صاحب ڈی۔ بی بیرسٹرایٹ لا پی ایچ ڈی ڈائرکٹر محکمۂ زراعت بھوپال مقیم لندن)

تین بجے سہ پہر کو جب میری موٹر شارع روامزین میں رکی تو فرانسیسی چہل پہل دیکھکر بمشکل

فتح پور سیکری کو اکبر سے ۔ جے پور کو جے سنگھ سے ۔ فاس کو حضرت ادریس سے اور مراکش کو یوسف بن تاشفین سے ۔ علاوہ صدہا عمارات و باغات کی تعمیر کے جہاں علاوہ عرب و بربر انجنیران کے ۳۰ ہزار نصرانی اسیران جنگ ٹوکریاں ڈھونے اور گارہ مچانے پر مامور تھے ۔ اسکی باڈی گارڈ کے گھوڑوں کی سائیسی پر نصرانی ہی ملازم رکھے جاتے تھے ۔ حرم سرا میں دو ہزار کنیزیں تھیں جن میں دو نصرانی مستورات ایک اسپانی اور دوسری انگریز بھی تھیں ۔ اولاد میں ۵۲۸ لڑکے اور ۵۲۰ لڑکیاں تھیں ۔ لیکن کثیر حرم اور لاتعداد عمارات دیکھکر یہ بدگمانی نہ کر بیٹھنا کہ وہ عیش پرست تھا ۔ اس کی نماز کسی وقت قضا نہ ہوئی اور نہ تلاوت کلام مجید ناغہ ہوئی لیکن یورپ کو اس سے بغض ہے اور کیوں نہ ہو جس نے انگلستان کو طنجہ سے مار مار کر بھگایا ہو جس نے اسبانیہ اور پرتگال کو مہدیہ ۔ العرائش ۔ سبتہ وغیرہ میں کچلا ہو جس نے فرانس کی شہزادی کانتی کا ڈولہ منگوانا چاہا ہو جس نے جیمس اول شاہ انگلستان کو جب اس نے امداد طلب کی تھی ۔ مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے کہا ہو ۔ اس کا ذکر خیر کے ساتھ یورپ کیوں کرنے لگا ۔ شہر گٹھا ہوا اور آبادی گنجان ہو بعض رستے حسب معمول اس قدر تنگ اور پیچدار ہیں کہ گھبی بھی نہیں گذر سکتی ۔ مکناسہ کے کاریگر مشہور ہیں اور سونے چاندی کا زیور بربری مستورات کے لئے بکثرت بنتا ہے ۔ گھٹیلے جوتے اور کامدار زیر پائیاں بہت خوبصورت بنتی ہیں ۔ لکڑی کی چوکیاں تپائیاں اور صندوقچے بھی اچھے نظر آئے لیکن ان کے علاوہ اور کوئی کام مکناسہ کا تجارتی پیمانہ پر نہیں ہوتا ۔ تمام بازار فرانس و امریکہ کے مال سے پٹا پڑا ہے ۔

قدیم عمارات میں تبیہ دیواروں کا طولانی سلسلہ جو مولائی اسمٰعیل کے خبط کی ہولناک یادگار ہے بیرون شہر دور تک پھیلتا ہوا چلا گیا ہے ۔ اسمٰعیل کا ارادہ تو فاس تک بخط مستقیم دورویہ دیوار تعمیر کرانے کا تھا لیکن حیات مستعار نے وفا نہ کی اور باب اسمٰعیل سے برج المانہ تک اور

یقین آیا کہ میں قبیلہ مکناسہ کے تعمیر کردہ ہمنام شہر میں موجود ہوں۔ ہوٹل طرانس اطلانتک کا آدمی اسباب کے لیے حاضر تھا جس کے مودبانہ اطمینان پر کہ میں وادی بوفکران کے ساحل پر مولائی اسمٰعیل کی دارالخلافۃ حضرت محمد بن عیسٰی کی زیارت گاہ۔ مغرب اقصٰی کی دارسائی میں پہنچ گیا ہوں۔ سامان گھبی میں رکھا اور شہر جدید کے نو طیار خوشنما فرانسیسی ہوٹل کے ایک آمادہ کمرہ میں پہنچ گیا جہاں سے شہر کا نظارہ تو نہایت دلفریب نظر آرہا تھا لیکن بعد مسافت کا خیال کر کے کہ میں شہر سے دو میل باہر پہنچ گیا ہوں دل پست ہوگیا۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے انتخاب ہوٹل میں افسوس کرنا پڑا۔ میں نے مکناسہ کا سفر اہل عرب و بربر کے دیدار کے لئے کیا تھا نہ کہ نصرانی آبادی کے نصرانی ہوٹل کی نصرانی نوجوان ہتمہ سے نظارہ بازی کے لئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وادی بوفکران کی گھاٹی اس قدر نشیب میں ہوگی اور اس کے ساحل اتنے بلند اور راستہ اس قدر پیچدار اور طولانی ہوگا لیکن سنگ آمد و سخت آمد۔ میں تین روز کا کرایہ پیشگی بھی ادا کر چکا تھا اب یہاں سے منتقل ہونے کی صورت میں کرایہ تو خیر کسی قدر وضعات کے بعد مل جائے گا لیکن مراسلت کی فرصت کسے۔ بالآخر صبر و شکر کے ساتھ خاموش ہوگیا اور اپنی خفت و حماقت مٹانے کے لئے برآمدہ میں دوربین لے کر شہر کا نظارہ کرنے لگا۔

نماز عصر کے بعد ہوٹل سے ایک رہبر لیا اور بسواری گھبی شہر پر سرسری نظر ڈالنے کے لئے باہر نکلا۔ شہر جدید کی خوش وضع عمارات۔ وسیع و ہموار راستوں سے گذرتا ہوا بوفکران کا رپٹہ عبور کر کے قدیم شہر میں کہ جس کا سلسلہ باب دار سمین سے شروع ہوتا ہے داخل ہوا اور شوارع رو امزین سمین۔ باب منصور سے گذرتا ہوا باب الجدید پر پہنچا۔ جہاں سے گاڑی رخصت کی اور پیدل آگے بڑھا۔

اس شہر کو مولائی اسمٰعیل (ہمعصر اورنگ زیب) سے وہی تعلق ہے جو دہلی کو شاہجہان سے

چوڑیاں ہاتھوں میں پہنے اور موٹے طوق گلے میں ڈالے نیلا لنگا پہنے اس کے پیچھے پیچھے گدھے کو ہنکاتی آرہی ہے۔ دوسرے روز صبح کو پھر کوچہ گردی کے لئے نکلا۔ اور قدیم شہر تعمیر کردہ اسمٰعیل کی طرف رخ کیا۔ دار المخزن بند تھا اور وہاں جانے کی اجازت بھی نہ تھی اور اگر اجازت بھی مل گئی ہوتی تو مکان بے مکیں اور سلطنت بے سلطان میں کیا دھرا ہے۔ سلطنت مغرب کا خلیفۃ المسلمین بیشک محمد بن یوسف ہے لیکن تاج سلطنت موسیو لوسیان سینت کے ہی سر پر درخشاں ہے ہر مخزنیہ شہر کے دار المخزن غیر آباد اور ویران پڑے ہیں حتیٰ کہ رباط الفتح کا دار المخزن کہ جہاں خلیفۃ المسلمین مولائی محمد بن یوسف دام سلطنتہٗ رونق پذیر ہیں۔ فرانسیسی رزیڈنٹ کے فرودگاہ کے مقابلہ میں خالی دیواروں کا مجموعہ ہے اور بس۔ ہر شہر کی طرح یہاں بھی شاہی باغ اجدل ہو مگر بے رونق۔ میرے پروگرام مرتبہ طرانس اطلانتک کمپنی میں چونکہ پہلے سے اس باغ کی سیر درج کرکے بگھی کا کرایہ وغیرہ پیشگی لے لیا تھا۔ اس لئے بادل ناخواستہ ایک چکر کاٹنا پڑا۔

لیکن مجھے مدرستہ الحرب واقع قصر دار البیضا دیکھنے کا شوق تھا جو اجدل کے قریب واقع ہو شام قریب تھی مدرسہ بند ہو چکا تھا۔ طلبا میدان میں گھوڑے کی سواری کر چکے تھے۔ درجہ بند تھے لیکن منتظم صاحب نے اپنے ایک اٹاچی کو مجھے سیر کرانے پر مامور کردیا۔ عمارت اچھی خاصی ہے میدان بھی وسیع ہے۔ قواعد۔ پریڈ شہسواری۔ تیراکی۔ فٹ بال کا بھی معقول انتظام ہو دار الاقامہ میں خورونوش کا انتظام ویسا ہی ہے جیسا دیرہ دون میں فرانسیسی فوج میں کھانا اچھا نہیں ملتا اور اس مدرسہ حربیہ کے مسلمان طلبار کو تو اور بھی خراب کھانا ملتا ہے۔ انتظام تقریباً ویسا ہی سخت وجفاکش ہے جیسا دیرہ دون کے مدرسہ حربیہ میں ہے لیکن نہ وہ انگریزی دبدبہ ہے اور نہ انگریزی ڈسپلن۔ ملازمین کام کرنے جاتے ہیں اور نارنگی کی قاشیں اڑاتے جاتے ہیں باورچی کھانا پکا رہا ہے مگر سگرٹ بھی ساتھ ہی ساتھ پی رہا ہے۔ خادمہ برتن دھو رہی ہے اور

باب ناعورہ سے للہ خضر آنک سد اسمٰعیل بن کر رک گئی۔ قدیم شاہی زمانہ میں یہاں شاید بھیڑ رہتی ہو لیکن مجھ کو ۱۹۳۱ء میں ایک متنفس بھی اس طولانی راستہ میں نہ دکھائی دیا۔ راستہ اس قدر سنسان اور بھیانک تھا کہ سہ پہر کو مجھے مکھی بیں جاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا اسی طرف دار المخزن ہے جہاں کسی زمانہ میں سلاطین مغرب بالخصوص مولائی اسمٰعیل عدل گستری کیا کرتا تھا لیکن اب تو اس کے وسیع چوگان اور اجڑے ہوئے مشور میں اداسی برس رہی ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں آٹھ ہزار رسالہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہاں اب ایک انسان بھی نظر نہیں آتا۔ اندرونی پھاٹک میں گنتی کے دو آدمی بلا وردی و بندوق کے ٹوٹے مونڈھوں پر بیٹھے جمائی لے رہے تھے۔ حرم سرا اجڑ گئی ہے اور سلاطین ماضیہ کی بیواؤں کی بدولت چراغ جل جاتا ہو ورنہ یہ عظیم الشان محل جہاں دو سو بیگمات اپنے حزم و حشم کے ساتھ رہتی ہوں کارگاہ عنکبوت ہوگیا ہوتا۔ اسمٰعیل کا مدینۃ الریاض پامال ہوگیا اور اس کی رکھوالی پر بجز ایک واحد باب الخمیس کے کہ جو سوگوار و غمگسار کھڑا ہوا ہے اور کوئی مامور نہیں۔

جس طرح طنجہ قبائل انجیرہ کا گہوارہ۔ تطاوین اندلسی عرب کا ملجا۔ فاس علما و فقہا کا مرکز دار البیضا بنی الفہ کا نشیمن اور مراکش قبائل دُکالہ و حاحہ کا آماجگاہ ہے اسی طرح مکناسۃ الزیتون کو بواخیر اور شرفا حسنی کا دنگل کہنا ناموزوں نہ ہوگا جس طرف جاؤ چوڑے چکلے سینہ اور زبردست ہاتھ پاؤں کے سودانی بواخیر حلقہ بگوش گروہ در گروہ کاندھے پر اوزاروں کا جھولہ ڈالے تلاش مزدوری میں پھرتے پاؤگے۔ شرفائے حسنی اپنے سادہ لباس۔ سفید عمامہ۔ خوشرو خط و خال سے ممتاز اور عبائے علم و فضل سے میز دکھائی دیں گے سلسلہ تجانیہ کے کمبل پوش اور سلسلہ عیسویہ کے گوشہ نشین بھی صبر و قناعت کی ردا سے ملفوف اژدحام خلق سے الگ الگ جا رہے ہوں گے بربری دہقان سر پر چٹائی کی چھپر دار ٹوپی رکھے سودا سلف خرید رہا ہے۔ اس کی عورت بھدی

گا رہی ہے۔ فوجی تعلیم کی مدت تین سال کی ہے جس کے بعد دو سال تک عملی تعلیم کسی رسالہ یا پلٹن میں کرنا پڑتی ہے۔ تب کہیں لفٹنٹ دوئم کا عہدہ بمشاہرہ یک صد روپیہ ملتا ہے۔ تعلیم کی رفتار بہت سست ہے اور بظاہر ۲۰ سال کی مدت میں بھی مغربی فوج کے جملہ عہدہ مسلمانوں سے پر نہ ہو سکیں گے۔ طلبار کے ساتھ برتاؤ برا نہیں لیکن جو مساوات پیرس کے کوچہ و بازار میں نظر آتی ہے وہ جبل اطلس میں گم ہو گئی ہے۔ طلبار فرانسیسی افسران سے جو بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں اور ذرا سی غلطی پر سخت ترین سزا نہایت بے دردی سے دیتے ہیں ہر وقت خائف رہتے ہیں مصارف تعلیمی یک صد روپیہ کے لگ بھگ ہیں۔ اس وقت ۴۰ عرب و بربر زیر تعلیم ہیں سکامیاب طلبار کا اوسط ۳ سالانہ ہے۔ فرانسیسی افسر بیحد سست، متکبر اور مثل سیماب متلون المزاج ہے۔ فضول بکواس۔ مذاق اور دل لگی اس کا قومی شعار ہے چلت پھرت اور فوجی آن میں ٹامی اٹیکن اس پر ہزار درجہ فوقیت رکھتا ہے۔ شہسواری کے لئے خندقیں اور ٹٹیاں بنی ہوئی ہیں لیکن ویسے پھسلنے والے رپٹے دیکھنے میں نہیں آئے جیسے ساگر کے فوجی مدرسہ میں موجود ہیں مساجد میں صرف جامع الاخضر اور جامع النوار کو دیکھ سکا لیکن مصلیوں کی تعداد ہر جگہ کم تھی۔ مدارس میں صرف مدرسہ بوعنانیہ کا سرسری معائنہ کر سکا۔ اس کی ڈیوڑھی اس قدر دیدہ زیب اور دوپہر کے وقت کہ جب میں خراب وخستہ اس میں داخل ہوا اس قدر ٹھنڈی تھی کہ آرام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مدرسہ کی عمارت مختصر ہے۔ در و دیوار پر ٹائل جڑی ہیں جن سے بہت صاف ستھرا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مغرب اقصیٰ کے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں ہوتی۔ مدرسہ نام ہے بورڈنگ ہوس کا جہاں طلبا قیام کرتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے طلبار کو مساجد میں جانا ہوتا ہے۔ البتہ اگر کسی مدرسہ میں کسی استاد کا قیام ہے تو وہ خالی اوقات میں طلبار کو کچھ امداد دیدیا کرتا ہے۔ ورنہ کسی مدرسہ پر درسگاہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ مدرسہ

بوعنانیہ کی عمارت چھوٹی ہے اور میں نے جب دیکھا تھا تو اس میں کل ۲۷ طلباء سکونت پذیر تھے جن کے خورونوش کا انتظام لنگر خانہ سے ہوتا تھا طالب علم جب فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدرسہ خالی کرتا ہے تو اپنی نشست نووارد طالب علم کے ہاتھ قیمتاً فروخت کر جاتا ہے۔ مدرسہ فلالہ کو میں نہیں دیکھ سکا جس میں سنتا ہوں کہ بربری قبائل کے لڑکے زیادہ رہتے ہیں لیکن تعلیم صرف حدیث و فقہ کی ہوتی ہے اور طلباء کی معلومات تاریخ و جغرافیہ میں مطلق نہیں۔ میں نے مدرسہ بوعنانیہ کے علاوہ بعض تجار اور اہل علم سے بھی دریافت کیا کہ ملک مغرب کا مالیہ کیا ہے۔ تجارت کس ملک سے زائد ہے۔ سلطان کا خطاب کب سے رائج ہے اور طرز حکومت کیسا ہے تو تشفی بخش جواب کوئی بھی نہ دے سکا۔

سلسلہ عیسویہ | یہ سلسلہ حضرت محمد بن عیسیٰ ساکن اندلس سے منسوب ہے جو مولائی اسمٰعیل کے عہد میں مغرب اقصیٰ میں ترک وطن کر کے حضرت جزولیؒ (مدفون مراکش) کے خلیفہ شیخ ابو العباس احمد الحراثی کے حلقہ خدام میں داخل ہو گئے تھے۔ پھر مکناسہ میں سکونت اختیار کی۔ جہاں غیر معمولی زہد و تقویٰ اور کشف و کرامات کے باعث مرجع خلائق بن گئے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے کبھی کسی کا سوال رد نہیں کیا آپ کے پاس اُس وقت جو کچھ ہوتا حاجتمند کو دیدیتے۔ اگر پاس کچھ بھی نہ ہوا تو ارشاد فرماتے کہ فلاں درخت کی پتی توڑ لے۔ ضرورت مند پتی توڑتا تو معاً وہ طلاء خالص ہو جاتی۔ ایک بار باتوں باتوں میں آپ نے مولائی اسمٰعیل کے سوال پر فرمایا کہ فقیر کے لئے مکناسہ شہر خرید کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت درخت کی پتیاں توڑ ڈالنا شروع کیں جو فوراً اشرفی ہونے لگیں۔ مولائی اسمٰعیل یہ کرامت دیکھکر دنگ رہ گیا لیکن آپ کی دعا حاصل کرنے کی غرض سے ایک ہفتہ تک آپ کی حکومت جاری رکھی۔ اسی طرح ایک اور قصہ مشہور ہے کہ ایک بھوکا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ کئی روز سے ایک دانہ بھی نصیب

نہیں ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کھاتا کیوں نہیں ہے اس نے عرض کیا کہ کیا کھاؤں۔ اتفاق سے ایک بچھو سامنے جارہا تھا آپ نے فرمایا کہ اس کو کھا جا حسن عقیدت دیکھو کہ وہ آدمی زندہ بچھو چٹ کر گیا اور اس کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔

آپ کے وصال کے بعد آپ کے مریدین میں سے للہ خمسہ نامی ایک خاتون بہت مشہور گذری ہیں مولائی اسمٰعیل نے اس فرقہ سے ناراض ہو کر سب کو تباہ کرنا چاہا اور اس غرض سے ایک حوض میں بہت سے سانپ اور بچھو بھروا کر مریدان عیسویہ کو اس میں جھونکوانا چاہا جس پر بیشتر معتقدین کے پاؤں ڈگمگا گئے لیکن للہ خمسہ نے آگے بڑھ کر ردا پھینک دی اور بے نقاب ہو کر ایک پرجوش تقریر کے بعد اللہ اکبر کے نعرہ کے ساتھ حوض میں کود پڑی۔ اس کا کودنا تھا کہ اور لوگ بھی دھا دھم گرنے لگے۔ بیشتر آدمی ہلاک ہوئے لیکن بعض سخت جان صحیح و سلامت بھی نکل آئے۔

یہ لوگ بہت نیک۔ صابر و شاکر ہوتے ہیں۔ سوال کرنا اور بھیک مانگنا ان کا مسلک نہیں قناعت و ریاضت ان کا شیوہ ہے۔ گھر سے باہر جب جاتے ہیں تو بھوکے نکلتے ہیں تاکہ زیادہ دیر باہر نہ پھر سکیں غیر مسلم بالخصوص نصاریٰ سے ان کو کاوش رہتی ہے اور نصاریٰ کی زبان سے برا کلمہ سنتے ہی فوراً مرنے اور مارنے پر تل پڑتے ہیں۔

لیکن اس گروہ میں بعض جاہل بھی ہیں اور شعبدہ بازی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

مولائی ادریس

(منقول از خط موسومہ برادر عزیز سید وہاج الدین پروفیسر اقتصادیات اورنگ آباد کالج حال مددگار وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ)

آج سے کچھ کم بارہ صدی قبل میدان فتح (حوالی مکہ مکرمہ) سے ایک نیک سیرت نیک صورت

عرب اس بے سروسامانی اور خوف وہراس سے خاک حجاز کو الوداع کہتا ہے کہ نہ کھانے کو روٹی ساتھ لیتا ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا ۔ مصیبت و افلاس ملک فراعنہ پہنچاتی ہے ۔ جہاں ایک شریف درحمدل پوسٹ ماسٹر جنرل عارضی پناہ دیتا ہے ۔ لیکن بغداد کا خوف چین لینے نہیں دیتا ۔ آخر غریب مسافر ملک نیل کو خیرباد کہہ کر قدم آگے بڑھاتا ہے ۔ لیکن بخت یاور ہمت دلاتا ہے گھبرانا نہیں ۔ دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تراست ۔ قدم آگے بڑھتا چلے ۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد ۔ غرضکہ صحرائے طرابلس ۔ ریگستان برقہ ۔ کھنڈرات قرطاجنہ ۔ کوہستان قسنطینہ ۔ زیبان الجزائر ۔ دشت ریف کو عبور کر کے مقام (ولیلی) پہنچتا ہے کہ چارم ماہ رمضان المبارک ۱۷۲ھ کا نیر تاباں افق مشرق سے بخت خوابیدہ کو بیدار کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے ۔ جمعہ کا دن ہے ۔ عرب و بربر جوق جوق جامع مسجد میں آرہے ہیں ۔ خارجیوں کی کثرت ہے ۔ عرب مسافر بھی موجود ہے جو ممبر پر چڑھ کر بلند و فصیح آواز میں ایک پُرشکوہ خطبہ کے بعد ہدایت کرتا ہے کہ "خبردار تم ہم کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف مت جانا کیونکہ تلاش حق میں تمہاری رہبری ہم سے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا ...... الخ"

ولیلی کا صوبہ دار اسحٰق زیری آگے بڑھتا ہے ۔ تلوار عرب کے قدموں پر ڈال کر بیعت کرتا ہے سرداران اوربہ ۔ زناتہ ۔ زواغہ ۔ لواتا ۔ غمارہ ۔ سدارہ لبیک کہتے ہیں ۔ اور اللہ اکبر کے نعرہ ہائے بلند میں نووارد عرب "امیر المسلمین" کی مسند پر متمکن کیا جاتا ہے ۔

اس کو پہچانا یہ کون تھا؟ ——— ایوان قریش کا شب چراغ ۔ گلزار فاطمہ کا نونہال باغ مصطفیٰ کا رکھوالا چمنستان سادات کا گل سرسبد ۔ سردار جنت کا پرپوتہ یعنی ادریس بن عبد اللہ بن حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام ؏

نہال باغ علیین	بہار مرغزار دین
نسیم روضہ یٰسین	شمیم دوحہ طٰہٰ

مغرب اقصیٰ کو خود مختاری کا درجہ انہیں کی ذات بابرکات سے حاصل ہوا اور اسوقت بھی یہ خاندان سادات سریرآرائے سلطنت ہے جس کا سلسلہ حضرت نفس الزکیہ تک پہنچتا ہے۔

حضرت ادریس تقریباً ۴ ½ سال حکومت کر کے ہارون الرشید کی سازش سے شہید ہوئے ان کے بعد ان کے صاحبزادے ادریس ثانی المعروف بہ ادریس الصغیر بانی شہر فاس امارت پر ممتاز ہوئے۔

انہیں ادریس اول کا مزار مبارک قصبہ زرہون میں ہے جو تباہ شدہ۔ ویران۔ وحشت کدہ ویلی کے قریب واقع ہوا ہے۔ اور جو حضرت ادریس کی دار الاقامت اور مزار ست گلزار بنا ہوا ہے۔ زمانہ سابق میں غیر مسلم کو مزار تک پہنچنا در کنار حدود قصبہ میں داخل ہونا مشکل تھا لیکن اب کہ ارض مقدس کے پاسبان اُٹھ گئے۔ مزار تک غیر مسلم کو جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

مکناسہ سے جب میں نے زیارت زرھون کا قصد کیا تو لالہ سنت رام سندھی تاجر نے بوجہ کفایت معمولی بس کی صلاح دی لیکن اس میں وقت بہت صرف ہوتا تھا اس لئے میں نے ایک پوری موٹر کرایہ پر لالہ صاحب کی معرفت ایک گنی میں کی اور محکمہ نشر و اشاعت سیاحت مغرب کی طرف سے ایک مسلمان رہبر نصف گنی میں کر کے دس بجے دن کو زرہون کو راہی جہاں براہ قصبہ الھرتان۔ رو خومان عقبۃ العربی ایک گھنٹہ میں پہنچ گئے۔ مسلمان رہبر ہمارے ساتھ تو ترکی ٹوپی اوڑھے رہا لیکن قصبہ میں داخل ہوتے ہی برنس کا کنٹوپ چڑھالیا کہ جو شرفا کا لباس ہے۔

مزار مبارک کا احاطہ وسعت میں آستانہائے حضرت سلطان الہند و سلطان نظام الدین وغیرہم سے بہت کم ہے۔ تین چھوٹے چھوٹے چوک ہیں جس کے بعد روضہ شریف ملتا ہے جو بہت فراخ۔ بلند اور ہوادار ہے۔ ہندوستان کے روضہ اکثر تنگ۔ تاریک اور غیر ہوادار واقع ہوئے ہیں جن میں تازہ ہوا آنے کے راستے محدود اور ہجوم خلائق سے تھوڑی بہت ہوا بھی کثیف ہوجاتی ہے

لیکن الحمدللہ کہ حضرت ادریس کا روضہ وسیع. روشن اور ہوادار ہے. در و دیوار کا مرصع کام دیدہ زیب ہے اسلامی عمارات (صخرہ شریف. جامع قرطبہ. مقصورہ جامع بلرم صقلیہ. قصر باردو تونس) کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہے. شفاف و مجلّا مرمری فرش پر مطلاو مذہب چھت کا عکس جگمگا رہا تھا. آیات کلام مجید اور قصاید منقبت کا زنجیرہ کانس کے نیچے نگاہ کو گھنٹوں الجھائے رکھتا ہے. کمخواب کی چادر پر طلائی مور چھل زربفت کی مسہری کے نیچے شہادت دے رہے ہیں کہ صاحب تاج و تخت کی خواب گاہ ہے. عقیدت مندان کا ارادت و خلوص تسبیح و تہلیل کا زمزمہ ہر جدید زائر کو ہوشیار کرتا رہتا ہے کہ.

بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ ہست سجدہ گاہ ہے ملک و روضہ شاہنشاہ ہست

ویلی

ویلی کا شوق مجھے مطلق نہ تھا لیکن مولائے ادریس کا قرب اُس خرابات کو جہاں شیطان سیرت کراکلا تاجدار روتہ الکبریٰ نے اپنی یادگار میں ایک محراب تعمیر کرائی تھی لیگیا. یہ بہیمی صفت بادشاہ فرانس کے شہر لیون میں پیدا ہوا تھا اور اپنے باپ سبت مئیس کے ساتھ انگلستان میں تھا کہ باپ کا سایہ اُٹھ گیا. کراکلا نے تخت و تاج کا دعویٰ کیا. اپنے بھائی غیطہ کو صاف کرنے کے ارادہ سے شمشیر برہنہ نکلا. بھائی اپنی ماں کی گود میں چھپ گیا لیکن کراکلا نے تلوار کھینچ کر وہیں اس کا کام تمام کیا. اس کے بعد تخت اطالیہ پر بیٹھکر اپنی حقیقی ماں کو کہ جس کے بطن سے تولد ہوا تھا اپنی زوجیت میں لایا (یورپی تہذیب!) مصر میں ایک بار گیا تو وہاں اس خنزیری حرکت پر چہ میگوئیاں ہوئیں اس کو طیش آیا اور قتل عام کا حکم دیا جس میں خون کی ندیاں بہ گئیں. کراکلا تعلّی. دروغگوئی. مکاری. آوارگی. زناکاری میں بدنام ہے.

جھوٹ اور سفید جھوٹ بولنے میں بڑا دلیر۔ زیٹ لگانے میں بے باک۔ اس کا عام شیوہ تھا کہ میں نے فلاں فلاں ملک بزور شمشیر فتح کئے درآنحالیکہ ان بلاد کا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ رومتہ الکبریٰ میں عظیم الشان حمام شناوری برہنہ عورتوں کو گھورنے کے لئے تعمیر کرائے جن کے ٹوٹے آثار اس وقت بھی موجود ہیں۔ پھر ایسے شیطان مجسم کی عمارت دیکھنے کا شوق کس مسلمان کو ہوگا لیکن رومتہ الکبریٰ اور یونان کی تہذیب میں ایسے بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔ خود رومتہ الکبریٰ کے شہنشاہ اعظم جولیس قیصر کے حال میں پادری لمپریر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ شہر کی ہر باکرہ عورت کا یہ شوہر تھا اور سلطنت عظمیٰ کا ہر مسٹنڈا اور رنگیلا چھبیلا جوان قیصر کا شوہر!!

خیر یہ ایک شکستہ محراب تھی جس کے دیکھنے کے لئے مجھ کو مولائی ادریس سے دو میل کا سفر کرنا پڑا۔ مقام افسوس ہے کہ اس ایک کھنڈر کی رکھوالی پر متعدد چوکیدار۔ داروغہ معمار اور مہتمم ہیں لیکن اسلامی مقابر شلہ۔ سلا۔ فاس۔ مراکش کی نگہداشت پر کوئی افسر نہ ملے گا لیکن اس کا گلہ کس سے کیا جائے۔ غیر ملکی اور غیر مذہبی حکومت کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

مجھے یہ محراب مطلق پسند نہ آئی۔ اس سے بدرجہا بلند و شاندار محرابیں اور پھاٹک دہلی۔ آگرہ۔ سہسرام۔ چین پور۔ آمیر۔ لکھنؤ وغیرہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ ہاں قدرت کی کارسازیاں قابل دید ہیں کہ سید الشہداء کے پرپوتے نے نور وحدت اسی کفرستان سے چمکایا تھا۔ اہل عرب دبر براس مقام کو قصر فرعون کہتے ہیں۔

فاس

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا دَارَ عِلْمٍ وَ فِقْہٍ یُتْلٰی بِھَا

لِتَا بُكَ وَتُقَامُ بِهَا حُدُوْدُكَ وَاجْعَلْ أَهْلَهَا
مُسْتَمْسِكِيْنَ بِالسُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ مَا أَبْقَيْتَهَا

(مشاہدات مندرجہ ذیل اُن خطوط کی نقل ہیں جن کو میں نے اپنے برادر عزیز منشی غنی محمد اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری جنت آرامگاہ نواب سلطان بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کو مغرب اقصیٰ سے لکھا تھا۔ دبیر)

اگرچہ رباط کی چہل پہل۔ دار البیضا کی صفائی۔ مراکش کے ازدحام کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن ۷ بجے شام کو جب میری موٹر حلقہ بطحا کی مصفیٰ سڑکوں کا چکر لگاتی ہوئی شارع کیبو کی پُر رونق اور جگمگاتے ہوئے افرنجی قہوہ خانوں اور سینما فرنسے کے قریب سے گذر کر چوراہہ نشانہ بازان پر رُکی تو ایک لمحہ کے لئے مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ موٹر کا دروازہ کُھل گیا تھا۔ قلی سامان کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا اور میں متحیر تھا کہ یہ جدید نو آبادی۔ یورپی ازدحام خواتین کے لباس نیم عریاں۔ میخانوں کی ناؤ و نوش۔ دوکانات کی آرایش اور حسن بے نقاب کے جلوے۔ اس متبرک و مقدس شہر میں جس کی تعمیر میں سید الشہدا حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پرپوتہ کی دعائے خیر و برکت شامل رہی ہو کہاں سے پیدا ہو گئی۔ میں اس وقت فاس میں ہوں یا یورپی ساحل اخضر کے کسی رند آباد میں۔ میں اسی حیرت میں تھا کہ ڈرائیور نے ٹوپی اتار کر مودبانہ عرض کیا کہ فرودگاہ آگئی ہے ...... آخر موٹر سے قدم باہر نکالا تو اپنے آپ کو گراں ہوٹل کے دھلیز پر کھڑا پایا۔ بواب نے دروازہ کھولا۔ بڑھ کر ہاتھ سے چھتری لی اور میں اس کے ساتھ حیرت و استعجاب میں ڈگمگاتا ہوا دفتر میں پہنچا۔ میرا کمرہ پہلے ہی سے رزرو ہو چکا تھا کنجی لے کر لفٹ میں کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک راہ گیر کے شیریں ترنم نے اپنی طرف متوجہ کر لیا جس کا یہ شعر میں نے ملازم ہوٹل کی

امداد سے اپنی بیاض میں ٹانک لیا۔

سلامٌ علیٰ فاس ووادی الجواہر سلامُ محب من صمیم السرائر

لیکن رافعہ اٹھ چکا تھا اور جب تک اوپر پہنچوں نغمہ کی آواز ڈوب چکی تھی اس لئے صرف یہی ایک شعر قلمبند کر سکا۔

آج غیر معمولی تکان ہو گیا ہے اس لئے کپڑے اتار کر سیدھا غسل خانہ میں گیا اور ٹب کے گرم پانی میں خوب کروٹیں بدل بدل کر جسم کو سینکا۔ غوطے پر غوطے لگائے۔ اور لوٹ پوٹ کر خستگی دفع کی۔ پھر کمرہ میں آنکر گرم کمل اوڑھ کر بستر میں گھس گیا۔ چند منٹ میں جب طبیعت ٹھکانے ہوئی تو بیٹ کی سوجھی۔

رات کے وقت یہ خطہ برقی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوا تھا جسے فرانس نے اپنے قدرتی شغف آرائش سے پیرس کا ایک ٹکرہ بنا دیا ہے۔ کرے دی لیون کا Cradih lyon گھنٹہ گھر ۸ ½ بجا چکا تھا۔ دیندار مسلمانوں کی بڑی جماعت نماز عشا سے فارغ ہو کر آغوش خواب میں جا چکی تھی لیکن شہر فاس کا یہ جدید خطہ جسے میں اپنی ناواقفیت سے فاس الجدید سمجھے ہوئے تھا۔ .... شیدائیان عیش و طرب سے گرم تھا۔ یورپی زن و مرد کے پرے کے پرے سڑکوں پر محو خرام تھے قہوہ خانوں میں آتش سیال سوزاں تھی سینما کے دروازوں پر ہزارہا قمقموں سے جنت الفردوس کا دھوکہ ہوتا تھا۔ میں کچھ دیر تو ادھر ادھر پھرتا رہا لیکن جب بھوک کا غلبہ ہوا تو اسلامی ہوٹل کی تلاش ہوئی۔ کشادہ آباد اور بارونق سڑکوں پر جہاں فرانسیسی رستوران میں کانٹا چھری کی جنگ ہو رہی تھی کوئی اسلامی ہوٹل کیوں نظر آنے لگا تھا۔ کبھی شارع بورژان پر چپ و راست

نظر ڈالتا اور کبھی شارع پوانکرے کی پیمایش کرتا تھا۔ لیکن اس "غیر ممکن" رقبہ میں جمعبندی از وقت کا خسارہ دیکھکر دل بیٹھ گیا۔ آخر ایک راہ گیر سے پوچھا جس نے کورا جواب دیا۔ دوسرے سے پوچھا لیکن مطلب براری نہ ہوئی۔ تھوڑی دور چل کر ایک مقدس بزرگ کو روکا جنھوں نے دائیں بائیں دیکھکر ارشاد فرمایا کہ یہاں کوئی مسلمان ہوٹل نہیں ہے۔ مجھ کمبخت کو بھی آج یہ ضد ہوگئی تھی کہ اس مرکز اسلام۔ سرچشمۂ علوم وفنون۔ وادی بطحہ میں کسی اسلامی دوکان ہی کے دسترخوان پر بسم اللہ کروں گا۔ اور آگے بڑھا۔ ایک ضعیف العمر مسلمان ملے جن سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد بھی ہے۔ جواب نفی میں ملا۔ دل میں جھلّایا لیکن مودبانہ عرض کیا کہ اس شہر کی پونے آٹھ سو مساجد کس کونے میں بند ہیں۔ اس پیر مرد نے کمال نرمی سے سمجھایا کہ شہر فاس یہاں سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ یہ تو جدید افرنجی شہر ہے۔ اب ذرا اطمینان ہوا۔ ڈھارس بندھی اور قدم دوسری طرف اٹھے۔ ایک افرنجی رستوران میں چند مسلمان اخبار فروش لڑکے دکھائی دیئے۔ ایک کران سے رہبری چاہی۔ میری وضع قطع دیکھکر ایک نے آگاہ کیا کہ یہاں کوئی اچھا رستوران نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تم مجھے بُرا ہی بتلادو۔ اس پر وہ میرے ساتھ ہو لیا اور ایک غیر آباد گلی میں لے جاکر ایک کثیف گندہ نان بائی کی دوکان پر پہنچا دیا جہاں ایک ٹوٹی میلی۔ لال لٹین دوکان کی سیاہ در و دیوار میلے اور بے قلعی کے برتنوں کی عیب پوشی میں مایوس ہو کر رو رہی تھی۔ ایلومنیم کی ایک دیگچی چولھے پر چڑھی تھی۔ خمیری روٹیوں کے ڈھیر پر ایک میلا رومال پڑا ہوا تھا۔ دو تین مزدور قہوہ کی پیالی سامنے رکھے قلیاں کے کش کھینچ رہے تھے۔ اخ تھو کے پچکاریوں سے فرش گلزار بنا ہوا تھا۔ دوکان دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ الٹے پاؤں بھاگا اور طفل رہبر کو ایک ہلیلہ دے کر رخصت ہوا۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ فاس الجدید اور فاس البالی جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دل کو سمجھایا کہ ایک وقت کھانا نہ ملا نہ سہی۔ بالآخر ایک قہوہ خانہ میں تھک کر دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ خادم نے آنکر پوچھا کہ کیا چاہیئے۔ میں نے چونکہ اسلامی ہوٹل میں کھانے کا عہد کر لیا تھا۔ اس لئے اس کو ایک فرانک دے کر پیچھا چھوڑایا اور خاموش تماشہ دیکھنے لگا۔ آخر گھنٹہ گھر کی برنجی زبان نے جب گیارہ بجے کی منادی کی تو اٹھا اور پژمردہ چہرہ خشک لب۔ خراب وخستہ دست و پا۔ خالی شکم اور ناتوان جسم زار کو لے جاکر کمرہ میں جا گرایا۔ کچھ خیال ہوا کہ شاید مراکش کی کھجوریں چرمی بکس میں ہوں گی۔ صندوق کھولا لیکن اللہ کا نام سچا۔ وہاں کھجور کے نام گٹھلی بھی نہ نکلی۔ آہ سرد بھر کر کپڑے اتارے۔ اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ شدت گرسنگی نے جب ستایا تو اٹھا۔ دو گلاس پانی غٹ غٹ کر کے اُتارے اور صبر و شکر کا سنگ گراں شکم پر رکھ کر سو گیا۔ تمام سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک اسلامی دارالسلطنت میں منہ میں ایک دانہ ڈالے بغیر اس طرح رین بسیرا کیا ہو۔

رات تو جوں توں گذر گئی ...... لیکن صبح جب کپڑے پہن کر ہوٹل کے دیوان خانہ میں اُترا تو بھوک سے بُرا حال تھا۔ لیکن قول مرداں جان دارد۔ باہر نکلا اور بگھی کرایہ کر کے فاس الجدید کی راہ لی۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ بدقسمتی سے کوچبان اندلسی عیسائی نکلا جس کی گنوار و زبان نہیں سمجھتا تھا۔ نہ وہ میری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باب الجدید پہنچکر وہ مجھے فصیل کے باہر باہر مقابر سلاطین مرینین دکھانے لے چلا۔ میرے ہاتھ میں فاس کا نقشہ تھا غلط راستہ پر جاتے دیکھکر ٹوکا اور ٹوٹی پھوٹی اسپانوی زبان میں کہا کہ جامع قیروینین چل۔ لیکن جب وہ نہ چلا تو میں کوچ بکس پر جا بیٹھا اور راستہ بتلایا لیکن وہ نہ مانا میں نے

راس ہاتھ میں لینا چاہی۔ اس پر اُس سے حجت ہوگئی۔ میں گاڑی سے اترنے لگا۔ وہ کرایہ کا متقاضی ہوا۔ میں نے کہا جامع قیروئین پہنچا تو کرایہ دوں گا۔ میں پھر کوچ بکس پر بیٹھ گیا وہ اسپانوی زبان میں بڑبڑا رہا تھا اور میں ٹھیٹ اردو میں طبع آزمائی کر رہا تھا۔ میں تو خیر اس کا ایک آدھ جملہ سمجھ بھی جاتا تھا لیکن وہ مِیش قادسی ایک حرف بھی نہ سمجھ سکا۔ آخر باب جلود سے نکلکر شارع طلعہ سے گذرتے ہوئے باب جدید پر گاڑی رکی۔ میں نے پوچھا جامع قیروئین کہاں ہے وہ کچھ بولا تو سہی لیکن میں مطلق نہ سمجھا۔ خوش قسمتی سے ایک دلّال نے جو وہاں اکثر ٹہلتے رہتے ہیں لپک کر بتلایا کہ مسجد تک بگھی کا راستہ نہیں۔ مجبوراً اترا اور کرایہ چکا کر اپنے آپ کو ایک دلیل کی ظل عاطفت میں سپرد کیا۔ شوق کو تقاضائے سیر و تفریح تھا۔ لیکن بھوک کا حملہ سب سے زبردست ہوتا ہے۔ سب سے پہلی صاف دوکان نان بائی کی جو نظر پڑی پیٹ وہاں لے پہنچا اور کباب۔ اسٹو۔ مولی۔ اچار۔ فیرنی سے شکم پُر کر کے اور اوپر سے وادی فاس کا پانی کہ جس کے سریع الہضم۔ نافع امراض جلد و مثانہ ہونے میں اہل شہر رطب اللسان ہیں خوب پیا۔ خیر نافع امراض ہونے کا تجربہ تو سہ روزہ قیام میں کچھ ہو نہ سکا۔ البتہ خالی پیٹ میں جب دو خمیری روٹیوں۔ گوشت۔ کباب اور دو طشتری فیرنی پر پانی کا دباؤ پڑا تو جسم آرام کا طالب ہوا دلیل صاحب کی مستعدی سے ایک گدھا بھی آگیا جو بکری سے کسی قدر اونچا تھا۔ مجھے پہلے پس و پیش ہوا لیکن پھر تجربہ کے لئے اس کی بے رکاب چارجامہ پر متمکن ہونا ہی پڑا لگام کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن لگام درکنار وہاں سوت کی ڈوری بھی نہ تھی۔ سائیس نے ایک قمچی دے کر ناصحانہ طور پر ہدایت فرمائی کہ جدھر موڑنا چاہو اُس کے خلاف دھیرے سے بید اس کے مُنہ پر مار دینا۔ یہ اسی طرف ہولے گا۔ غرضکہ اس شان و شکوہ سے

کہ آگے آگے سائیس۔ بیچ میں میں اور مجھ سے ملا ہوا میر اور وزیر خوش تدبیر یعنی دیّل تھا۔
میرا جلوس دارالسلطنت فاس میں نکلا۔ مختلف شوارع سے گذر کر ایک نشیبی راستہ
ملاحس کے چکنے النگوں پر پانی بہ جانے سے پھسلن پیدا ہو گئی تھی۔ وہاں گدھے کا پیر
پھسلا۔ لگام تھی نہیں کہ میں روکتا۔ گدھا تو خیر سنبھل گیا اور خوب سنبھلا لیکن راکب بچنے کے
خیال سے جو کودا تو پیروں پر قائم نہ رہ سکا۔ ربردار جوتہ نے دھوکہ دیا اور چشم زدن میں
ارض فاس نے آغوش محبت میں لپٹا لیا۔ دیّل صاحب اور سائیس صاحب نے لاش
اٹھائی۔ یہ منظر بھی عجیب تھا کہ میرا کابینہ عالیہ ہمہ تن متاسف میں ہمہ تن خجل۔ اور صغیر
سن ہنس مکھ حاضر الوقت راہ رو۔ ہمہ تن متبسم۔ آج بھوپال میں بیٹھ کر جب اس نظارہ
کا تصور آتا ہے تو پشیمان ہو جاتا ہوں۔ خیر میں اللہ آمین کر کے اٹھایا گیا۔ رومال سے
پتلون صاف کیا گیا اور خفت مٹانے کی غرض سے وہاں سے فی الفور پیادہ پا چل دیا۔
اور باب جلود پر جا کر دم لیا۔ جہاں پشیمانی میں کچھ کمی ہوئی۔ اپنی وزارت کو ڈسمس کیا۔
اور قریب کی ٹکسی میں منہ چھپا کر گران ہوٹل کی راہ لی۔ کمرہ میں پہنچکر کپڑے اتارے۔
رباط الفتح میں جو دوا دافع وجعل المفاصل لی تھی وہ جسم اسفل پر ملی اور پلنگ پر آنکھیں
بند کر کے لیٹ گیا۔ دل نے کہا کہ اگر دونوں وقت اسی طرح شہر جدید سے فاس البالی
کی دوڑ دھوپ میں حمار افگنی کے واقعات پیش آتے رہے تو عجب نہیں شہزادہ کے
شہر خوشاں میں مستقل جاگیردار ہونے کا شرف زبردستی حاصل ہو جائے اس لئے ارادہ
کر لیا کہ آج ہی سر شام فاس البالی میں مستقل بسیرا اختیار کرنا چاہیئے اس خیال سے
محکمہ نشر و اشاعت سیاحت کو ٹیلیفوں سے کھڑ کھڑایا اور ہوٹل دار جامعہ کے ایک
کمرہ کو بکرایہ ساٹھ فرانک ٹھیرالیا۔ سہ پہر شہر کی جغرافیائی معلومات میں کاٹی اور شام کو

فاس البالی کی راہ لی۔

بنیاد فاس | ادریس الصغیر نے جس وقت ویرانہ ولیلی سے اپنا مستقر بدلنا چاہا تو دامن جبل زلاغ کے اس مرغزار کو جس کی آبشاری میں تین چھوٹی مگر بارہ ماسی ندیاں (فاس شبر، شر زیتون) ہمیشہ رواں دواں رہتی ہیں پسند کیا لیکن اس رقبہ آراضی پر قبائل بنوزواغہ و یرغش جھونپڑیاں ڈالے پڑے تھے اس لئے یرغش کا حصہ ۱½ ہزار اور زواغہ کا حصہ ۳½ ہزار درہم میں خرید کر کے ماہ ربیع الاول ۱۹۲ھ مطابق ۲ر فروری ۸۰۸ء کے اولین پنجشنبہ کو بعد نماز ظہر (تعمیر شہر قیروان سے ۱½ صدی اور تعمیر بغداد سے ۴۷ سال بعد) حضرت ادریس ثانی نے اپنے تبر (فاس) سے دور کھینچکر پروردگار عالم سے دعا مانگی کہ اس معمورہ کو مرکز علوم و فنون۔ ملجا و ماوی علما و فقہا بنانا۔ یقیناً اس دعا کو بارگاہ صمدیت میں درجہ قبولیت عطا ہوا کیونکہ یہ شہر تقریباً بارہ سو سال سے مغربی افریقہ میں ممالک الجزائر تونس صحرا سوڈان آل غنا کا سرچشمۂ علوم و فنون بنا ہوا ہے۔ بغداد کے مدارس تاتاری سیلاب میں بہہ گئے نیشاپور کی جامعہ مٹ گئی۔ خراسان و دیلم کی درسگاہیں بند ہو گئیں۔ دمشق کا مدرسہ عمر بن عبدالعزیز ایک معمولی مکتب کی حیثیت پر اُتر گیا ہے۔ قیروان و مہدیہ کی انجمنیں فنا ہو گئیں قرطبہ۔ اشبیلیہ۔ طلیطلہ۔ بطلیوس و غرناطہ کے نام صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ لیکن اے شہر فاس تیرے حق میں جو دعا "باب مدینۃ العلم" کے ایک نام لیوا نے مانگی تھی وہ مقبول بارگاہ ہوئی اور تیری جامعہ قیروئیین حدیث و فقہ تفسیر و کلام سے ابھی تک گونج رہی ہے۔

تسمیہ | شہر فاس کی تسمیہ کے متعلق تین مختلف دلچسپ روایات سنی گئیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت ادریس نے چونکہ اپنے تبر (فاس) سے اس کا حصار کھینچا تھا اس لئے

اس کا نام فاس ہو گیا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ایک روز جبکہ حضرت ادریس تعمیر کی نگرانی کر رہے تھے فارس نامی مسافر کا جسے لکنت کی شکایت تھی ادھر سے گذر ہوا۔ مزدوروں نے اس کا نام پوچھا تو ہکلا کر جواب دیا۔ فہ۔ فہ۔ فا۔ س (حرف "ر" زبان سے ادا نہ کر سکا) مزدوروں نے مذاق اڑایا اور فہ۔ فہ۔ فا۔ س کا مذاق ہونے لگا جس کی وجہ سے شہر کا یہ نام پڑ گیا۔ تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ سب غلط۔ بلکہ تعمیر جدید سے قبل جبکہ قبائل بربر غش وزواغہ یہاں آباد تھے تو اس قریہ کا نام "ساف" تھا۔ چونکہ اس ویرانہ کو حضرت ادریس نے ایک مشہور شہر میں منقلب کر دیا۔ اس لئے اس کا نام بھی اُلٹ دیا جو ساف سے فاس ہو گیا۔

بہرحال جو کچھ ہو یہ شہر بہت جلد آباد ہو گیا جس میں مسلمانان اندلس نے گرانقدر امداد دی یعنی اندلس کے ہزارہا عرب جو حکم بن ہشام (ہمعصر مامون رشید) امیر قرطبہ کی سخت گیر حکومت اور مخرب اخلاق حرکات سے کہ جو سلاطین رومہ واطالیہ کی تقلید میں اکثر نو عمر لڑکوں کو خواجہ سرائے کے لئے خصی کرایا کرتا تھا۔ بیزار ہو کر شہر فاس میں آنکر پناہ گزیں ہوئے۔ اُس وقت یحیٰی بن یحیٰی یکے از ارشد تلامذہ امام مالک کا قرطبہ میں دور دورہ تھا۔ انھوں نے حکم کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ شہزادہ محمد بن قاسم کی بیعت کی تحریک بھی درپردہ شروع کر دی۔ لیکن شہزادہ نے حکم سے کہدیا جس نے اپنے معتمد ابن الخدا اور جمعدار یزنتو کو تحقیقات کا حکم دیا۔ شہزادہ محمد نے ایک روز علمائے کبار کی دعوت کی اور اُن سے پوچھا کہ میری بیعت پر کون کون تیار ہے۔ علماء نے نام گنانا شروع کئے۔ ابن الخدا جو پس پردہ بیٹھا تھا نام لکھنے لگا۔ قلم کی سرسراہٹ سن کر علماء کے پیروں تلے کی مٹی نکل گئی مجلس منتشر ہو گئی یحیٰی نے طلیطلہ میں پناہ لی۔

حکم نے ولیعہد سلطنت عبدالرحمٰن اور عمروس سپہ سالار کو سرکوبی پر مامور کیا عمروس نے حکمت عملی سے کام لے کر ایک شب علمائے دین متین ودیگر اعیان سلطنت کی دعوت کی اور کھانی کے لئے ایک ایسا دالان تجویز کیا کہ جس کا راستہ ایک تنگ وپیچدار سرنگ میں ہو کر گیا تھا اور جو اس قدر تنگ تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی جا سکتا تھا۔ مہمانان یکے بعد دیگری جا رہے تھے لیکن ان کو کیا خبر تھی کہ بجائے طاس کے ان کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑینگے چنانچہ ہاتھ دھلانے والی خدام بجائے آفتابہ وطشت کے تیغ وخنجر سے کام کر رہے تھے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہوا وہ یہ کہ الحکم کی باڈی گارڈ میں صقلبی غلامان کا جو دستہ تھا اس کے ایک سوار نے اپنی تلوار صاف کرنے کے لئے ایک صیقل گر کو دی۔ یہ رمضاں کا مہینہ تھا صیقل گر وقت معینہ پر تلوار صاف کر کے نہ دے سکا صقلبی سوار اور شہری صیقل گر میں جھگڑا ہو گیا سوار نے صیقل گر کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ رعایا کو جو صقلبی رسالہ کی چیرہ دستی پر نالاں تھی ایک اچھا خاصہ موقعہ مل گیا۔ رسالہ کو جا گھیرا اور جب صقلبی جوانوں نے کہ جو زیادہ تر نو مسلم نصرانی تھے محل میں پناہ لی تو وہاں جا پہنچے۔ حکم نے فوج کو مدافعت کا حکم دیا۔ رسالہ نے رعایا کے مکانات میں آگ لگا دی اور جب بلوائی اپنے مکانات بچانے کے لئے لوٹے تو ان کو نوک سناں پر رکھ لیا۔

اس شورش میں حکم کی خوش طبعی اور ستم ظریفی قابل دید ہے کہ جب محل کے پھاٹک پر گھمسان لڑائی ہو رہی تھی تو حکم نے اپنے نصرانی غلام بزنتو سے کہا کہ عطر کا کنٹر اٹھا لا۔ غلام نے بتعمیل ارشاد کر کے عرض کیا کہ عطر ملنے کا یہ کیا وقت ہے۔ حکم نے جواب دیا کہ یہی تو وقت ہے تاکہ بصورت شہادت میری نعش خوشبو سے پہچانی جا سکے۔

قصہ کوتاہ اس بد اہنی سے تقریباً ساٹھ ہزار عرب اندلس کو خیر باد کہکر ممالک غیر شتل

فاس۔ اسکندریہ۔ افریطش کو نکل کھڑے ہوئے۔ اس میں سے تین ہزار نے فاس کے ایک حصہ میں سکونت پذیر ہو کر اپنی آبادی کا نام عدوہ اندلس رکھ لیا جو آجتک قائم ہی اسی طرح شہر کے دوسرے حصہ میں قیروان کے جلاوطن شدہ آکر آباد ہوئے اور انھوں نے اس محلہ کا نام عدوہ قیروئیین رکھا۔

فاس کی آبادی جب زائد بڑھی تو ۳ شوال المکرم سنہ ۶۷۴ھ (مطابق سنہ ۱۲۷۶ء) ایک دوسرے زاہد و عابد۔ شب بیدار و تہجد گذار۔ فقیہ و محدث فرمانروا سلطان یعقوب المنصور نے فاس کے مغربی جانب محلات شاہی۔ سپاہ۔ دار الضرب وغیرہ کے لئے ایک قطعہ آراضی پسند کر کے ایک آبادی قائم کی اور اس کا نام بوجہ اس کے کہ جملہ مکانات و عمارات سفید قلعی سے بنی ہوئی تھیں۔ مدینۃ البیضاء رکھا۔ سلطان یعقوب المنصور کو سفید لباس پسند تھا۔ اور اس کا وہ دربار جس میں اسبانیہ کے نصرانی تاجدار شانجہ کو شرف حضوری بخشا گیا تھا۔ سیاہ و سفید رنگوں کا متضاد نقشہ پیش کرتا تھا یعنی ایک طرف عربی رسالہ عربی فوج عربی وزراء و اہل دربار سفید لباس میں تھے اور ادھر شانجہ اور اس کے امرا سیاہ لباس میں حاضر تھے اس دربار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ان ہر دو حریفوں میں معاہدہ بھی عمل میں آیا جس کے بعد یعقوب المنصور نے ایک رسالہ نصرانی اسبانیہ کے جوانوں سے تیار کیا۔ معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ شانجہ ملک اسبانیہ سے نایاب قلمی کتابوں کا ذخیرہ پیش کرتا رہے گا چنانچہ اس نے تیرہ چھکڑے کتب عربیہ کے ایک بار بھیجے تھے جو شروع میں تو مدرسہ صفارین میں رکھوائی گئی تھیں لیکن بعد میں جامعہ قیروئیین میں منتقل کر دی گئیں لیکن مقام افسوس ہے کہ جامعہ قیروئیین کا یہ علمی ذخیرہ بہت کم ہو گیا ہے اور اس وقت چند ہزار سے

زائد اس کی تعداد نہیں ہے۔

غرضکہ ساتویں صدی ہجری میں شہر فاس دو آبادیوں پر مشتمل ہو گیا تھا ایک فاس اور دوسرا مدینۃ البیضا۔ کچھ عرصہ بعد ان کی تسمیہ میں تبدیلی ہوئی اور اس وقت تمام شہر کو "فاس البالی اور مدینۃ البیضا کو "فاس الجدید" کہتے ہیں۔ زمانہ عروج میں شہر فاس میں ۷۸۵ مساجد۔ ۶۰۰ حوض آبنوشی۔ ۱۰۰ احمام۔ ۲۰۰ مدارس و کالج۔ ۲۰۰ سرائے۔ ۴۷۲ پنچکیاں۔ ۹۹ ہزار بڑی حویلیاں۔ ۱۹ ہزار چھوٹے مکانات۔ ۴۷۷ دو کانات اکل و شرب ۱۰ ہزار دو کانات۔ ۲ ہزار ساہو کارے اور ۳ ہزار چھوٹے بڑے کارخانے تھے

پھاٹک | شہر فاس کے دس بارہ پھاٹک ہیں جن میں باب جلود۔ باب محروق۔ باب عجیسہ۔ باب وجدہ۔ باب الفتوح۔ باب حدید۔ باب سجمع۔ باب دکاکین قابل ذکر ہیں لیکن جس طرح دہلی کے پھاٹک بیکار و بوسیدہ شکستہ اور غیر معروف ہو چلے ہیں۔ اسی طرح فاس کے پھاٹک بھی اپنی شان و شوکت ضائع کر چکے ہیں۔ بعضوں میں کواڑ نہیں بعض گر رہے ہیں بعض جگہ فصیل کو گرا کر راستہ بنا لیا گیا ہے۔

مجھے باب محروق دیکھنا ضروری تھا اور خوش قسمتی سے پہلے ہی دن صبح کے وقت ادھر سے گذر ہوا اور گاڑی سے اتر کر مٹی کے اس ڈھیر پر کہ جس پر کسی طرح قبر کا اطلاق نہیں ہو سکتا میں نے اس مظلوم۔ بےکس۔ جلا وطن کی تربت سمجھ کر فاتحہ پڑھا کہ جس کا نام نامی بحیثیت ایک نقاد۔ شاعر۔ مورخ۔ اور ادیب کی عربی زبان میں ابد الآباد تک قائم رہے گا یعنی علامہ ابن الخطیب وزیر اعظم و سپہ سالار عساکر غرناطہ مصنف احاطہ فی تاریخ غرناطہ (یہ کتاب جامعہ عثمانیہ میں ترجمہ ہو رہی ہے) اسی تودہ خاک میں تقریباً ساڑھے پانچسو سال سے نذر آتش ہونے کے بعد محو خواب ہے۔ علامہ موصوف کو ذو الوزارتین کا درجہ

دو سلاطین غرناطہ کے دربار میں حاصل تھا لیکن دور آخر میں سازش کے شکار ہوئے۔ الحاد و کفر کا اتہام لگایا گیا۔ فاس کے جیل خانے میں جھونکے گئے۔ جہاں دشمنوں نے ایک رات گلا گھونٹ کر کام تمام کیا اور اسی پر صبر نہیں کیا بلکہ اس معصوم کی لاش جلا کر دل کے پھپھولے ٹھنڈے کئے۔ اسی مناسبت سے اس دروازہ کا نام باب محروق پڑ گیا ہے ہندوستان سے چلتے وقت ارادہ کیا تھا کہ اس کی اور معتمد کی تربتوں پر ایک ایک کتبہ نصب کراؤں گا۔ لیکن مزار کی ناگفتہ حالت۔ آس پاس کا ملبہ اور راستہ کا نشیب و فراز دیکھکر پانچسو روپیہ کا تخمینہ مجھ کو بتلایا گیا پردیس میں یہ رقم میرے لئے بڑی چیز تھی۔ میں سو روپیہ تک نذر کرنے کے لئے تیار تھا اس سے زائد کے لئے کیسہ خالی تھا۔ مجبوراً فاتحہ ہی پڑھا ایک بار نہیں بلکہ دن رات میں جب کبھی ادھر گذر ہوتا اس کی روح طیب سے ہم کلام ہونیکی سعادت حاصل کرتا۔

کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں ڈاکو اور رہزن گرفتار ہونے کے بعد اس پھاٹک پر سولی سے لٹکائے جاتے تھے۔

باب عجیسہ بھی تاریخی دروازہ ہے کہ یعقوب المنصور نے بعد فتح ارک (اسبانیہ) اس کو تعمیر کیا تھا۔ ۱۹۱۲ء کی شورش میں عربوں نے فرانسیسی افواج کو یہاں سخت ہزیمت دی تھی لیکن پھر چند ہفتہ بعد فرانسیسی کمک نے پہنچکر سارا شہر فاس تسخیر کر لیا۔ فرانسیسی گولہ باری کے نشانات بیشتر مکانات، منارہ جات وغیرہ پر دیکھنے میں آتے ہیں۔

فاس کی خصوصیات جس طرح استنبول کو ایا صوفیہ سے۔ قاہرہ کو ازہر سے۔ دہلی کو قطب مینار اور آگرہ بلکہ سارے ہندوستان کو تاج محل سے شرف حاصل ہے اسی طرح فاس کو جامع قیروئیین اور زاویہ مولائی ادریس سے شہرت ہے۔ قروئیین تو خیر پہلے ہی روز دیکھ لی تھی

لیکن درگاہ عالیہ پر دوسرے روز جا سکا۔ شارع بخارین سے جس وقت آگے بڑھا ہوں گا خوشبودار ہوا کے جھونکوں نے جو روضۂ مبارک کے بخور وعطریات سے ہم کنار ہو کر آ رہے تھے وارفتہ کر دیا۔ عقیدتمندوں کا گروہ مودب کھڑا تھا۔ تجلیاتِ عالیہ سے تمام حوالی منور اور طنطنہ شاہی سے سارا دربار دم بخود تھا کیوں نہ ہو آخر کس کی بارگاہ ہے۔

رافع اوضاع بدعت۔ ناطر اعلام دیں ناحی آثار طغیاں۔ قاطع ظلم وستم

آستانت موضع دولت نہ اکنون ست آدیس دار د این قصر معلّٰی نقش تاریخ درم

دروازہ سے داخل ہو کر دو صحنوں سے گذرتا ہوا جہاں گداگروں کا مجمع تھا میں اندر کے دالاں میں پہنچا جہاں سادات حسنی کا سردار حضرت مولائی ادریس اعظم کا فرزند خاص۔ کنزہ کا لعل مغرب اقصیٰ کا تاجدار ادریس الصغیر محوِ خواب ہے۔ مرقد مبارک بلند و ممتاز ہے جس پر ایک سبز پھولدار چادر پڑی ہے۔ دو مورچھل دائیں بائیں رکھے ہیں۔ ایک شامیانہ زردوزی کا چار نقرئی پاؤں پر ایستادہ ہے۔ سرہانہ کلام مجید رکھا ہے۔ وسط مزار پر چھت سے ایک گنگا جمنی لالٹین آویزاں ہے۔ مزار کے پاس معتقدین کا انبوہ تھا۔ امیر و غریب۔ بربر و عرب مصری و تونسی۔ زابی وریفی۔ مشرقی و مغربی اس شعر کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

درویش و غنی بندہ این خاک در اند آنانکہ غنی تراند محتاج تراند

جامع قیروویین فاس میں آباد ہونے والے جو باہر سے آئے اُن میں ایک متمول تاجر محمد الفہری نامی تھے جو شہر قیروان سے ترک سکونت کر کے یہاں آئے اور دو عصمت مآب لڑکیاں فاطمہ اور مریم چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ ان دونوں نے ترکہ پدری سے دو مساجد جامع قیروویین اور جامع اندلس تعمیر کرائیں۔

جامع قیروویین کے ۱۴ دروازہ ۲۷۰ ستون اور ۲۱ محرابدار صفیں ہیں جن میں ۲۲ ہزار

آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں کسی زمانہ میں ۱۳۰ جھاڑ روشنی کے لئے تھے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۱۷ دینار سرخ تقریباً چھ ہزار روپیہ تھی۔ ہر جھاڑ میں ۵۲۰ گلاس روشنی کے تھے ماہ رمضان المبارک میں روزانہ تمام جھاڑ و فانوس روشن ہوا کرتے تھے لیکن اب صرف ختم کلام مجید پر بتاریخ ۲۷ رمضان ساری مسجد میں چراغاں ہوتا ہے۔ اس وقت دو ہزار برقی لمپوں میں سے رات کو صرف ۷ قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ آب وضو کا انتظام نہایت عمدہ ہے وسط مسجد میں سفید بے داغ سنگ مرمر کی نہر جاری ہے۔ دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے بارہ دری نما سقایا اس قدر خوشنما و سبک ہیں کہ ان پر الحمرا کی قصر اساد کا دھوکہ ہوتا ہے سقایا سے شفاف و سرد پانی کی دھار جھم جھم کرتی مستانہ وار آتی ہے اور دوسری بارہ دری کی طرف پہنچ کر روپوش ہو جاتی ہے۔ ایسی سفید شفاف خوشنما نہر عالم اسلام کے کسی شہر میں نہ دیکھنے میں آئی اور نہ سننے میں قلعہ معلی دہلی کی نہر وضو خانہ بند ہے اگر جاری بھی ہو تو فاس کی نہر کو نہیں پہنچ سکتی۔

مسجد کا منارہ بلند نہیں ہے لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ بارہ بجے شب سے حفاظ منارہ پر چڑھ کر وظائف پڑھنے لگتے ہیں۔ ہر حافظ نصف نصف گھنٹہ با آواز بلند وظائف و آیات قرآنی پڑھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آس پاس کی مخلوق حفاظ کی آواز سے رات کا وقت دریافت کر لیتے ہیں۔

جامع اندلس | فاس کے اس حصہ میں جس کو عدوۃ الاندلس کہتے ہیں مریم فہری نے یہ مسجد تعمیر کرائی لیکن اندلس مرحوم کی طرح یہ محلہ چونکہ غیر آباد ہو رہا ہے اس لئے نمازیوں کی تعداد یہاں کم ہوتی ہے لیکن سلطان الطلباء کا سالانہ جلسہ اسی مسجد میں ہوتا ہے۔

اس مسجد کے منارہ پر بھی حفاظ رات کو وظائف پڑھتے ہیں لیکن دو بجے کے بعد سے۔

جامعہ قیروئیین دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے ۔ ازہر اس کے بعد تعمیر ہوئی اس وقت جامع قیروئیین میں ڈیڑھ سو اساتذہ ۵۔۶ سو طلبا کو مختلف علوم وفنون ۔ فقہ ۔ حدیث فلسفہ منطق ۔ ریاضی ۔ ادب وغیرہ میں درس دیتے ہیں ۔ مغرب کے علاوہ الجزائر ۔ سوڈان ۔ تن بکتو ۔ آل غنا صحرائی اعظم سے مسلمان طلبا یہیں تحصیل علم کے لئے آتے ہیں ۔

جامعہ اندلس میں اساتذہ اور طلبار کی تعداد بہت کم ہے ۔

مدارس ملک مغرب کے اکثر شہروں میں سلاطین وقت کے اوقاف سے طلبار کی امداد ہوتی رہتی ہے ۔ فاس کے چند مدارس تاریخی ہیں ۔ مدرسہ سے یہاں مراد دارالاقامہ ہے جہاں طلبائ قیام کرتے ہیں ۔ ہر مدرسہ کے ساتھ لنگر خانہ جاری ہے جہاں سے جملہ طلبار کو دونوں وقت مفت کھانا ملتا ہے لیکن مدرسہ میں داخلہ بہت مشکل ہے ۔ فارغ التحصیل طالب علم جب اپنا کمرہ چھوڑتا ہے تو کوئی جدید طالب علم سو دو سو روپیہ کے معاوضہ پر اس کی جگہ حاصل کرنے پر کامیاب ہو سکتا ہے ۔ قدیم طالب علم اپنے کمرہ کی کنجی اس کو دے جاتا ہے اور یہی دلیل اس کے قبضہ کی ہے ۔ فاس میں یوں تو بہت مدارس (دارالاقامہ) ہیں لیکن میں صرف پانچ تاریخی مدارس کو سرسری طور پر دیکھ سکا ۔ ہر مدرسہ میں ۲۵ ۔ ۳۰ سے لے کر ۵۰ ۔ ۶۰ طلبار کی رہائش وطعام کا انتظام ہے ۔ کمرہ معمولی ہوتا ہے اور ایک ہی جانب ایک دو کھڑکیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے زائد ہوا دار نہیں ہوتے ۔ ہر مدرسہ ایک طرح کا چھوٹا سا مکان ہے جس کے وسط میں ایک فوارہ یا حوض ہے ۔ ایک جانب چھوٹی سی مسجد ہے ۔ کسی مدرسہ میں برقی روشنی کا انتظام نہیں ہے اور نہ کسی کمرہ میں پلنگ یا تخت دکھائی دیا سیتل پاٹی یا بیب کا شکستہ وریختہ فرش ضروریات زندگی کے لئے کافی سمجھا گیا ہے ۔ ایک سماوار ایک لوٹا ایک کثیف گدہ ایک دو کہنہ کمبل اور چند دریدہ کتابیں غریب طالب علم کا اثاثہ ہیں ۔

۱۔ مدرسہ صفارین | کہتے ہیں کہ اس مدرسہ میں جسے یعقوب المنصور کی تعمیر سے شرف حاصل ہے اندلس کے نصرانی امیر شانجہ نے تیرہ چھکڑے کتب عربیہ کے بھیجے تھے جو کچھ عرصہ بعد یہاں سے جامعہ قیروویئین کو منتقل ہو گئی تھیں۔

اس کی مختصر سی مسجد میں ایک سیاہ پتھر نصب ہے جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ سے لایا گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اسی مسجد کا قبلہ زیادہ صحیح ہے۔

۲۔ مدرسہ صہریج | اس مدرسہ میں ۴۲ طالب علم رہتے ہیں۔

۳۔ مدرسہ مصباحیہ | میرے لئے یہ مدرسہ خاص دلچسپی رکھتا تھا کیونکہ اس کا حوض ایک سالم سنگ مرمر کے ٹکڑہ سے کاٹا گیا تھا جسے اندلس سے لائے تھے۔ یہ مدرسہ مولانا مصباح الدین صاحب کے نام نامی سے منسوب ہے جو یہاں کے معلم اعلیٰ تھے۔

۴۔ مدرسہ بوعنانیہ | ابوعنان نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں جس کو اُس نے فصد کھولنے کے بہانہ سے مروا ڈالا تھا قائم کیا تھا۔ سلطان مذکور کے متعدد مدارس۔ مکناسہ۔ مراکش وغیرہ میں قائم ہیں اور جہاں کہیں ہیں بہت آباد ہیں۔ اس دارالافاضہ کی عمارت کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ ایسی لاجواب خوشنما۔ سبک اور دل کش عمارت یورپ کے کسی اسکول کو نصیب نہیں ہوئی۔ انگلستان کا کوئی بورڈنگ اس قدر خوبصورت نہیں ہے۔

اس وقت طلبار کی تعداد ۶۰ تھی۔

۵۔ مدرسہ شراطین | یہ مدرسہ مولائی عبدالرشید کی یادگار میں قائم ہے جس نے رسم سلطان الطلبا جاری کی تھی لیکن اس کی فضیلت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اندلس کے نامور فقیہ و محدث حضرت ابوعبداللہ مصنف اخبار الصالحین اسی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے اور اسی کے پاس ایک مکان میں رہتے تھے۔

مولائی عبدالرشید سے پہلے مغرب اقصیٰ کا سکہ مربع شکل میں ہوا کرتا تھا اس نے اس کو بدل کر مدور کر دیا۔

سلطان الطلباء | مغرب اقصیٰ کی اس بے نظیر حوصلہ افزا۔ قابل ستائش ولائق تقلید رسم کی تاریخ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ آج سے تقریباً تین صدی قبل شہر تازا کا ایک کروڑ پتی یہودی ابن مشعل نامی بوجہ بدامنی وخانہ جنگی بہت زور پکڑ گیا تھا۔ کروڑوں کا لین تھا اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کے باشندے اس کے مقروض نہ ہوں۔ ملک کا ساہوکارہ اسی کے دم سے تھا۔ سلطنت اس کی مقروض تھی اور شہر فاس کا تو ہر فرد اس کے سود در سود جال میں جکڑا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اس کو تعیش کا چسکہ بھی پڑ گیا تھا۔ شہر فاس کی ایک شریف مگر مفلوک الحال سیدزادی کو جس کے حسن وجمال کا شہرہ دور دور پھیلا ہوا تھا اس نے اڑانا چاہا۔ اس کے والدین ابن مشعل کے مقروض تھے ایک طرف افلاس اور اس پر یہودی کے قرضہ کا بار گراں اور دوسری طرف ہاشمی خون کا جوش۔ ابن مشعل کا پیام سنا تو پیروں تلے زمین نکل گئی لیکن جامع قیروئین کے ایک غیور طالب علم کی رگ حمیت جوش میں آگئی والدین کی آہ وزاری سن کر اس نے صبر واستقلال کی تلقین دی اور ابن مشعل کو کہلا بھیجا کہ فلاں تاریخ لڑکی کا ڈولہ پہنچے گا۔ والدین اپنی بساط کے مطابق جہیز کا انتظام کر رہے ہیں۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر ایک شاندار ڈولہ جس کے جلو میں ۴۰ پالکیاں دیگر سہیلیوں کی تھیں۔ ابن مشعل کی حویلی میں رات کے وقت پہنچا۔ بدمست یہودی نشہ میں چور جب استقبال کو صحن میں پہنچا تو دلہن نے تلوار حمائل کی۔ دوسری سہیلیوں نے بھی اس کی کنیز و باندیوں کا کام تمام کیا حویلی میں تہلکہ مچ گیا مگر جانباز عروس اور اس کی سہیلیوں نے اس وقت تک خنجر میان میں نہ رکھا جب تک حویلی کے زن ومرد کو جن کی تعداد بہت زائد نہ تھی صاف نہ کر لیا۔ پھر ابن مشعل کے

اصطبل سے گھوڑے نکالے اور راتوں رات فاس پہنچکر دم لیا۔

یہ کارروائی تھی رشید اور اس کے رفقائے قیروئیین کی۔ لڑکی کے والدین باغ باغ ہوگئے اور اظہار شکریہ میں اپنی لڑکی اس کے حبالہ نکاح میں دیدی۔

انقلاب زمانہ نے رشید کو جو شاہی خاندان کا ایک نونہال تھا مسند خلافت پر پہنچا دیا۔ جس نے سلطان الطلبار کی رسم اس طرح جاری کی کہ طلبائے فاس اپنے گروہ سے ہر سال ایک قابل ترین متعلم کو سلطان الطلبار کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ حکومت کا اعلان ہے کہ انتخاب کی اطلاع دار المخزن میں پہنچنے کے بعد۔ سارا لوازمہ شاہی (رسالہ۔ پلٹن۔ باڈی گارڈ۔ پولیس۔ بینڈ باجہ سیکرٹریٹ) آٹھ روز کے لئے جدید سلطان الطلبار کی اردلی میں پہنچ جائے شبدیز شاہی سواری کو آتا ہے۔ خدام و مصاحب جلو میں ہوتے ہیں۔ ماہی مراتب کا جلوس ہوتا ہے۔ توپخانہ شلک سلامی اتارتا ہے۔ آٹھ روز تک سلطان الطلبار کی حکومت قلمرو مغرب میں ہوجاتی ہے۔ باشا۔ محتسب۔ قاضی القضاہ۔ مقدم محصل اس کے احکام کی تعمیل پر پابند ہوتے ہیں۔ پہلا جلوس جمعہ کو نکلتا ہے اور وہ مع حشم و خدم .... جامع مسجد میں جاکر نماز ادا کرتا ہے خطیب مسجد سلطان الطلبار کا نام خطبہ میں پڑھتا ہے۔ بعد نماز اسی شان و شکوہ سے جلوس شہر کا چکر لگاتا ہوا مولائی رشید بانی رسم کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھتا ہے۔ آٹھ روز تک سلطان الطلبار کے سامنے سکرٹریان حکومت۔ کاتبان سلطنت حاجبان وقت عرائض پیش کرتے ہیں جملہ اسٹنہ مقدمات مرجوعہ اس کے اجلاس پر آتی ہیں کوتوال شہر اسی کے دربار میں خیریت کی رپورٹ سناتا ہے۔ مظلومین اسی کی بارگاہ میں دادخواہ ہوتے ہیں۔ آٹھویں روز یعنی دوسرے جمعہ کو سلطان وقت اس سے ملنے کو آتا ہے۔ مگر کس طرح۔ بجز چند ذاتی خدام کے اس کی جلو میں کوئی نہیں ہوتا۔ نہ رسالہ ہوتا ہے

نہ باڈی گارڈ۔ نہ پولیس نہ ایڈی کانگ۔ اس کو جب اطلاع ملتی ہے تو پیشوائی کو بڑھتا ہے مگر کس طرح۔ آگے آگے توپخانہ چلتا ہے پھر رسالہ۔ سڑک کی دونوں جانب فوج سلامی اتارتی جاتی ہے۔ خدام ہٹو بچو پکارتے ہیں۔ بینڈ باجہ بجتا ہے۔ کوتوال و افسران فوج اردلی میں چلتے ہیں۔ سلطان الطلبا مع اپنے ہم ندما و مصاحبین کے جو جامعہ قیروئین کے اعلیٰ طلبا ہوتے ہیں طنطنہ شاہی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ دونوں قریب پہنچتے ہیں سلام علیکم کے بعد سلطان وقت پوچھتا ہے کہ کس ارادہ سے آپ یہ فوج لے کر آئے ہیں صلح کے لئے یا جنگ کے لئے سلطان الطلبا عرض کرتا ہے صلح کے لئے۔ پھر راہوار سے اتر کر سلطان مغرب کی رکاب کو بوسہ دیتا ہے اور دونوں بادشاہ جامع اندلس کو ادائے نماز کے لئے جاتے ہیں خطیب ممبر پر کھڑا ہوتا ہے تو سلطان الطلبا خطیب مسجد کو خطبہ میں سلطان وقت کا نام پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ بعد نماز جلوس از سر نو تیار ہوتا ہے لیکن نقشہ بدل جاتا ہے۔ سارا لوازمہ شاہی سلطان مغرب کے جلو میں ہوتا ہے۔ غریب سلطان الطلبا یہ یک بینی و دو گوش اپنی اصلی ہیئت کدائی پر آجاتا ہے اور اس وظیفہ پر جو حکومت کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے صبر و شکر کر کے اپنے وطن مالوف کو سدھارتا ہے۔

دار البطحا رنگیلے۔ کھلنڈرے۔ بدمست۔ شوقین مزاج عبد العزیز سابق تاجدار ملک مغرب اقصیٰ و حال نظر بند شہر طنجہ کا یہ ایک محل ہے جس کے تین حصے کر دیئے گئے ہیں ایک میں فوجی کلب ہے۔ دوسرے میں عجائب خانہ تیسرے میں سرکٹ ہوس۔

عجائب خانہ عجائب خانہ مختصر ہے۔ بمبئی و کلکتہ در کنار جے پور کا عجائب خانہ بھی اس سے بہت بڑا ہے۔ ایک کمرہ تاریخی آثار قدیمہ سے یعنی لوح مزارات۔ منبر۔ مصلے۔ دہلیز کے پتھر وغیرہ سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرے کمرہ میں مقامی چینی کے برتن۔ مرتبان۔ ہانڈیاں۔ گلدستہ

جاتے ہیں۔ جہاں کی خواتین اپنے بالوں کو اس سے دھوتی ہیں۔ ہندوستان کی انگریزی دوکانات پر بھی اس کی پڑیاں چار چار چھ چھ آنہ کو بکتی ہیں۔ اس بازار میں اور ایک بازار پاڑچے میں میں نے مغربی مستورات کو اکثر سودا سلف خریدتے دیکھا۔

مدرسہ عالیہ مولائی ادریس یہ جدید مدرسہ جمہوریہ فرانس کا قائم کردہ ہے جس میں بیش قرار تنخواہوں کے نااہل نصرانی فرانسیسی مدرس اور چھوٹی مشاہرات کے متبحر۔ تجربہ کار مغربی مدرس کام کرتے ہیں بظاہر اعلیٰ تعلیم مقصد ہے لیکن دراصل بربر اور عرب میں تفرقہ اندازی مقصود ہے۔ بربر قوم کی پراکرت کہ جس میں کوئی ادب نہیں ہے مدرسہ میں پڑھائی جارہی ہے حیرت تو یہ ہے کہ ملک فرانس کی کسی درسگاہ میں فرانس کی متعدد رائج الوقت پراکرت میں سے کوئی بھی پراکت نہیں پڑھائی جاتی۔ نہ انگلستان میں ویلش زبان پڑھائی جاتی ہے نہ اسکاچ زبان اور نہ شمال وجنوب انگلستان کی کسی پراکرت کی طرف انگریزی یونیورسٹیوں کو توجہ ہے لیکن اس واحد اسلامی ملک میں ایک نیم مردہ۔ غیر معروف پراکرت کی ترویج سنے باہمی کدورت ومنافرت پیدا کرنا مقصود نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اتفاق سے ایک فرانسیسی پروفیسر سے میری غائبانہ خط وکتابت تھی اور میں ان کی ہمہ دانی کا بہت مداح وثناخواں تھا لیکن یہاں آنکر معلوم ہوا کہ میرے سوالات کے جوابات وہ اپنے ایک مغربی مسلمان نائب سے پوچھ پوچھ کر دیا کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر فرانسیسی پروفیسران نے عرب مولوی اپنے اپنے گھروں پر ملازم رکھ چھوڑے ہیں جن سے کتب درسیہ کے اسباق پڑھ کر مدرسہ میں لیکچر دینے آجاتے ہیں۔

یہاں مجھے ہندوستان کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک نہایت ہی مہتم الشان تاریخی دارالعلوم میں ایک یورپی پروفیسر السنہ عربی کی تعلیم کے لئے بہت بڑی تنخواہ پر ملازم

رکھے ہیں۔تیسرا کمرہ نمونہ جات زردوزی شل بٹوہ۔زنانہ صدریان۔کمربند۔پٹکہ۔طیلسان سلیپر وغیرہ سے آراستہ ہے۔چوتھا کمرہ سامان حرب۔بندوق۔قرابین پیش قبض خنجر و شمشیر زرہ۔خود۔نیزہ۔تیر و تبر۔توپ۔منجنیق سے ہولناک بنا ہوا ہے۔چھٹا کمرہ مقامی و غیر ملکی فرنیچر سے آراستہ ہے۔میں چلتے چلتے کسی قدر تھک گیا تھا ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔
محافظ نے بتلایا کہ اسی دیوان پر سلطنت مغرب کا قتل نامہ قوم اسلام کا مرثیہ لکھا گیا تھا یعنی فرانسیسی فوجی افسر اعلیٰ اور مولائی عبد الحفیظ نے ۱۹۱۲ء میں معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے مغرب نے فرانس کی حکومت و سیادت۔اپنی ماتحتی و غلامی قبول کی تھی۔اسی کمرہ کے پاس ایک بڑا آہنی پنجرہ ہے جس میں بوحمرا نامی مجاہد کو جس نے فرانس کی پیشقدمی دیکھکر سلطان عبد الحفیظ کے خلاف جہاد شروع کیا تھا مقید کر کے شیروں سے پھڑوایا گیا تھا میں نے دل میں کہا کہ ملک فروشی کے لئے کون سی جگہ موزوں تھی صوفہ یا پنجرہ۔

دار بیضا اسی محل کا ایک بڑا حصہ فرانسیسی بالادست کی سکونت کے لئے مخصوص ہے۔جس کے کشادہ دیوان خانے۔نہر رواں۔پُر تکلف خوابگاہ۔شاندار شہ نشین۔ہوادار غلام گردش یورپی و اسلامی ساز و سامان سے آراستہ دپیراستہ نائب جمہوریہ فرانس کی سطوت و جلال کا اعلان کر رہی ہیں۔

نہیں بادشاہی تو آخر خدائی
جو ہے آج اپنی تو کل ہے پرائی

بازار یوں تو بہت سے بازار اور سوق قیساریہ ہیں لیکن سوق عطارین ہر وقت فی الحقیقت طبلہ عطار بنا رہتا ہے۔میں نے روغن چنبیلی کی ایک شیشی دس فرانک میں خریدی ہندوستان میں بھی یہی قیمت ہے۔مختلف عطروں سے بازار کا بازار مہک رہا ہے۔برگ حنا(مہندی) سائیدہ وغیر سائیدہ بکثرت فروخت ہوتی ہے اور اسی ملک سے ہزارہا بورے یورپ کو

رکھ کر بلائے گئے۔ اتفاق سے میرے ایک دوست جنھوں نے میٹرک تک عربی پڑھی تھی اُن سے ملنے کے لئے گئے۔ پروفیسر صاحب دوسرے کمرہ میں تھے ان کی اطلاع ہوئی اور ملاقاتی کمرہ میں بٹھلائے گئے جس کی میز پر چند عربی کتب رکھی تھیں۔ ایک کتاب میرے دوست نے اٹھاکر دیکھنا شروع کی۔ اتفاق سے یہ الف لیلہ تھی۔ دو تین منٹ کے بعد یورپی علامہ بھی تشریف لے آئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ الف لیلہ کا جدید اڈیشن یورپ میں طبع ہوا ہے۔ میرے دوست کی سمجھ میں ایک فقرہ نہ آیا تھا۔ پوچھنے لگے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے کتاب ہاتھ میں لی جملہ پڑھا۔ مکرر پڑھا سہ کرر پڑھا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ شروع صفحہ سے لے کر آخر صفحہ تک ملاحظہ کیا لیکن جواب نہیں دیتے۔ آخر میرے دوست نے پوچھا کہ اس کے کیا معنی ہیں ارشاد فرمایا کہ تم نے بہت ہی سخت جملہ منتخب کیا۔ یہ قدیم غیر مانوس دہقانی عربی ہے جس کی تشریح میں بعد میں کرکے بھیجدوں گا۔

یہ تھا مبلغ علم اُس پروفیسر کا جو ایم اے کا عربی ممتحن ہوا کرتا تھا۔

مولائی یعقوب

یہ مقام شہر فاس سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے اور گندھک کے چشمہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ رباط میں میرے گھٹنوں میں درد پیدا ہوگیا تھا اس لئے ایک صاحب کی سفارش پر نہانے کی غرض سے دوپہر کو میں ادھر گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا چشمہ شملہ کے تتاپانی کی طرح ہو لیکن پانی کھولتا ہوا نکلتا ہے۔ نہانے کا کوئی انتظام معقول نہیں ہے۔ نہ کوئی گھاٹ ہے نہ سیڑھی ہے نہ چوکی ہے نہ غسل خانہ۔ میری موٹر کا شور سُن کر دو چار بربری لڑکے پہنچ گئے

ایک معمر بربری نے ایک تہ بند پیش کیا۔ لیکن کھلے میدان میں نہانے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن چونکہ خفیف کسک گھٹنوں میں موجود تھی اس لئے پتلون اتار کر تہ بند سے ستر چھپایا اور گھٹنوں کو تولیہ تر کر کے تھوڑی دیر تک سینکتا رہا۔

خیر نہانا دھونا تو ایک معمولی بات ہے لیکن جس چیز نے میرے دل پر خاص اثر کیا وہ اسلامی اخوت و مہماں نوازی تھی کہ بلا کہے سنے میرے لئے بربری روٹی۔ انڈے۔ انگور چلے آرہے ہیں اور اصرار کیا جا رہا ہے کہ میں ضرور ان کو کھاؤں۔ یہ کہنا بھول گیا کہ زیتون کا اچار بہت زیادہ تھا اور قہوہ تو پانی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ چلتے وقت میں نے اپنے میزبان عیسیٰ جزولی کے بچوں کو ۵۰ فرانک دیئے جو بڑی مشکل سے قبول کئے گئے۔

صفروی

مناظر قدرت۔ آب رواں اور بزرگان دین کے مزارات کے باعث اس قصبہ کو جس کی آبادی سندیلہ کی برابر ہوگی خاص عظمت حاصل ہے۔ اوہام پرستی اور خوش عقیدگی نے حضرت دانیال علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اصحاب کہف کی قبور اور غار بھی بنا رکھے ہیں لیکن میں ان قصوں کو سرے سے غلط اور بے بنیاد سمجھے ہوئے تھا اس لئے ان کے لئے نہیں بلکہ صرف مناظر قدرت اور باغات کی سیر کو چلا گیا تھا۔ نارنگی۔ سیب۔ چیری۔ آلو بخارہ کے باغات چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ نہج طاق صبت اور شباک میں احمد غبرت اور اس کے بھائی کے باغات اچھے ہیں جن کو میں نے اچھی طرح سے دیکھا۔ نارنگی لدی ہوئی تھی آلو بخارہ ختم ہو چکا تھا۔ چیری پر خزاں کا اثر تھا۔

مزارات بھی بکثرت ہیں جن میں سے علامہ حسن بن مسعود مشہور ادیب و فقیہ و محدث

کے مزار واقع زاویہ لحسن میں فاتحہ کے لئے جا سکا۔غسل کے لئے ڈیل نے کہا لیکن جب قسطنطنیہ کے ترکی حمام مجھ کو پسند نہ آئے تو اس دور افتادہ قریہ کے نیم پختہ۔ تاریک اور کثیف حمام میں کیسے جا سکتا تھا۔ وادی صفروی جو آگے چل کر نہر البہود کے نام سے مشہور ہو گئی ہے دیکھی۔ گھاٹ کے قریب اس کا پانی میلا سا ہے لیکن آگے چل کر صاف ہو گیا ہے۔ قہوہ خانہ میں میری خوب آؤ بھگت ہوئی اور چلتے وقت سیدی عامر بن حسین مالک نے ایک لکڑی ہاتھ میں رکھنے کے علاوہ چار ڈبہ مربائے چیری کے کہ یہاں کا بہترین تحفہ ہے زبردستی پیش کی۔ میں بار بار انکار کر رہا تھا لیکن اس کا اصرار غالب آیا اور مجھے یہ تحفہ قبول کرنا ہی پڑا۔ چیری کی لکڑی انگلستان میں آٹھ دس روپیہ سے کم میں نہیں ملتی۔ مربہ کا ڈبہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ میں ہندوستان میں بکتا ہے۔ یہ خاطر مدارات صرف اس لئے تھی کہ حاجی حرمین شریفین ہونے کے علاوہ مجھے حضرت ابا ایوب انصاریؓ سے نسبت ہے۔ وطن آ کر میں نے سیدی عامر کو بھوپال کے دو بٹوہ اور کٹک کی ایک نقرئی منقش ڈبیہ بھیجدی۔

تازا

یہ شہر جس کی فصیل اور جامع مسجد اولین موحدی امیر عبدالمومن کی تعمیر کردہ ہیں جس کی سرزمین پر مولائی عبدالرحمٰن نے قبائل زناتہ کے غیر تربیت یافتہ انبوہ کو فرانس سے مقابلہ کرنے کے لئے جمع کیا تھا لیکن جس کا نتیجہ ساحل ایسلی پر اسلامی ہزیمت کی شکل میں رونما ہوا۔ اور پھر جس نواح میں مولائی محمد المعروف بہ بوحمارہ نے ۱۹۰۲ء میں مولائی عبدالحفیظ کیخلاف علم بغاوت بلند کر کے زک کھائی اور اپنی جان عزیز فرانسیسی مشیروں کی رائے پر شیروں کے سامنے اس طرح نذر کر دی کہ پنجرہ میں بند کر کے گرسنہ شیروں سے پھڑوا ڈالا گیا۔

لیکن سب سے ممتاز واقعہ جس نے طغرائے امتیاز اس کو دے رکھا ہے یہ ہے کہ اسی شہر میں سلطان الطلبا۔ کی رسم کی داغ بیل پڑی تھی۔ ابن مشعل اسی جگہ کا باشندہ تھا اس کی مکانات اور دوکانات ابھی تک باقی ہیں۔

میرا کاروان گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیئے یہاں رکا۔ میں نے ایک ٹکسی کرایہ کی اور ابن مشعل کا مکان اور عبدالمومن کی تعمیر کردہ جامع مسجد دیکھنے کو چل نکلا ابن مشعل کا پرانا مکان جس میں یہ واقعہ ہوا تھا کھد گیا ہے لیکن اور مکانات باقی ہیں جن میں یہودی آباد ہیں۔

جامع مسجد شہر کے ایک گوشہ میں ہے مضبوط و مستحکم عمارت ہے۔ آرائش وزیبائش سے معرا لیکن صاف ستھری اور سنتا ہوں کہ نمازیوں سے بھر جاتی ہے۔ اس کے امام عبداللہ نامی ایک بربری بزرگ ہیں جو یہیں کے باشندے ہیں۔ امیر عبدالکریم ریفی تازا کے قریب ۲۶ھ میں پہنچ گئے تھے لیکن یورپی سیاست نے پیشقدمی روک دی اور فرانس نے نظر بند کر کے افریقہ کے ایک چھوٹے جزیرے میں بٹھا دیا۔

ووجدہ

یہ شہر جسے ملک مغرب کا "باب المشرق" کہنا ناموزوں نہ ہوگا اور جو اپنی باقرینہ صاف۔ ستھری شوارع۔ بلند و ہوادار امریکانی عمارات سے ایک جدید نو آبادی معلوم ہوتا ہے۔ میری آخری منزل تھی۔ میرے پاس نہ تو زیادہ وقت تھا اور نہ اطمینان خاطر اس لئے اسٹیشن پر سامان چھوڑ کر ایک گھنٹہ میں جو کچھ سرسری طور پر دیکھ سکا دیکھ لیا۔ کیونکہ جدائی کا صدمہ شاق گذر رہا تھا اور اگر پروگرام آگے سے مرتب کر کے ممالک الجزائر وتونس کے ہوٹلوں کو مطلع نہ کر دیا ہوتا۔ تو شاید سرزمین مغرب اقصیٰ سے اس قدر

جلد باہر قدم نہ نکالتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اکثر ہوٹلوں کا کرایہ پیشگی چکا کر کمرے رزرو کرائے تھے اور بصورت التواء ہرجانہ وغیرہ سے زیر باری کا اندیشہ تھا۔ یورپی سیاح کے لئے مغرب اقصیٰ کسی قسم کا سامان لہو لعب عیش و نشاط پیش نہیں کرتا اور نہ اس کے لئے چنداں ارزاں ہے لیکن شیدائی اندلس کے لئے ملک عزیز سے محبوب تر تھا میں اس کی ہر چیز میں مرحوم اندلس کی کوئی نہ کوئی جھلک دیکھتا تھا۔ اس لئے اپنی سیاحت مغرب کی آخری منزل پر پہنچکر میں اس قدر افسردہ خاطر تھا کہ وجدہ کی شاندار جامع مسجد اور اس کا اعظم ترین فانوس دیکھنے کو بھی مطلق جی نہ چاہا۔ رخت سفر اتار کر اسٹیشن پر ہی ٹھیرنا چاہا لیکن ریل چھوٹنے میں کئی گھنٹہ کی دیر تھی اور اسٹیشن پر بدقسمتی سے کوئی ویٹنگ روم نہ تھا۔ اس لئے مال گودام میں سامان سپرد کرا کر ایک ٹکسی سیر کرنے کے لئے نہیں بلکہ وقت کاٹنے کے لئے لی اور شوارع مغنیہ، اولاد عمران۔ اولاد عیسیٰ۔ اولاد وجدہ۔ مسجد عقبہ۔ مسجد یونس کا چکر لگا کر ایک معمولی ہوٹل کے برآمدہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اس شہر میں کسی کے نام کا خط تعارف بھی میرے پاس موجود نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو شاید افسردہ دلی ملنے جلنے میں مانع ہوتی۔ مجھے اپنی حیات مستعار میں پہلی بار اس وقت رنج و اندوہ کا سامنا ہوا تھا جب سنہ ۱۹۲۴ء میں گلزار اندلس نے اپنا دامن مجھ سے چھڑایا تھا اور اب کی بار مغرب اقصیٰ سے نکلنا قیامت ہو گیا۔ اگرچہ بلحاظ تہذیب و تمدن آسایش و ارزانی تعلیم و تجارت۔ دولت و حشمت۔ اہل مغرب اہل ہند سے بہت پیچھے ہیں لیکن ان کی دریدہ برانس۔ بوسیدہ طیلسان کمخواب و سنجاف سے بہتر۔ پژمردہ و ویران اجدل۔ ایڈن گارڈن سے خوشتر۔ شکستہ قصور یادگار وکٹوریہ سے برتر۔ وادی بورج رج آب گنگ سے شیریں تر پاتا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یاران اندلس کا جلوہ اس میں نظر آتا تھا۔

ووجدہ جس کی بنیاد قوم زناتہ کے سردار زیری ابن عطیہ نے آج سے ۹½ صدی قبل ۹۹۴ء میں رکھی تھی عہد فرانساوی میں اچھا خاصہ بین الاقوامی شہر بن گیا ہے مسلمانوں کی مردم شماری گھٹ گئی ہے۔ فرانسیسی چھاونی کی بدولت نصاریٰ کی تعداد یوماً فیوماً ترقی پذیر ہے اس کے علاوہ یورپ کی ہر ترقی یافتہ دولت کا نمائندہ یہاں موجود ملے گا۔ نہ ملیگا تو ایشیا کا کاہل مسلمان۔

میدان ایسلی

(تلخیص از خط موسومہ ڈاکٹر حامد رضا صاحب تیموری ڈی لٹ فرانس)

تازا سے وقت روانگی میں نے شوفر کو ایض نورانی کا ایک سکہ دیکر ہموار کر لیا تھا کہ وادی ایسلی میں موٹر آہستہ چلائیگا یعنی دریائے ایسلی کا ریتہ عبور کر کے آٹھ دس منٹ موٹر روک کر مجھ کو معائنہ علاقہ کا موقعہ دیگا۔ چنانچہ ابھی و وجدہ پانچ چھ میل ہوگا کہ موٹر کی رفتار سست پڑگئی میں نے دوربین سنبھالی اور جہاں تک نظر اور دوربین نے کام دیا علاقہ کو بغور دیکھنا شروع کیا جو شل ایک بے شجر چٹیل مسطح میدان کے ہے۔ رود ایسلی کہ جو ہندوستانی برساتی نالہ کی برابر ہے پیچ وخم کھاتی ہوئی جاری ہے۔ نشیب و فراز برائے نام ہے۔ کمینگاہ اور گھات کے لئے بہت کم موقعہ ہے۔ موٹر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور میں چپ و راست دیکھتا تھا۔ بالآخر ریتہ آگیا اور موٹر اس کے پار ہو کر رک گئی۔ میں پھاٹک کھول کر باہر کودا۔ دیگر فرانسیسی مسافر بھی اتر پڑے۔ شوفر نے ڈھکن اتار کر انجن دیکھنا شروع کیا لیکن ساتھ ہی مسافران کی دلچسپی کے لئے سپہ سالار بوژو کی نصرت اور محمد عبدالرحمن کی ہزیمت پر ایک مختصر تقریر دلپذیر بھی شروع کردی میں متحیر تھا کہ اس کھلے غیر محفوظ میدان میں عربوں نے اپنے آپ کو کیوں

ہلاکت میں ڈال دیا تھا۔ فرانسیسی مبالغہ نے اس کامیابی کی تفسیر میں بطور "زیب داستاں" یہ حاشیہ آرائی فرمائی ہے کہ فرانسیسی سپاہ ابھی کنیر کی گل چینی میں مصروف تھی کہ چند فیرون نے پراگندہ اسلامی لشکر کو پسپا کر دیا۔ لیکن عرب اس کی تصحیح کرتا ہے کہ فرانسیسی سپاہ عربی اجتماع کے سامنے اشجار کنیر کی آڑ میں چھپے جارہے تھے اور مسلمان اپنی ناتجربہ کاری اور جوش شجاعت میں اللہ اکبر کے نعرے مارتے ہوئے کھلے میدان میں آنکر فرانسیسی بارتوپ کا نشان بن رہے تھے۔ فرانس کہتا ہے کہ عربوں کی تعداد ۱½ لاکھ سے کم نہ تھی۔ بربر کا بیان ہے کہ ۲۰ ہزار سے زائد مسلمان نہ تھے اور وہ بھی فاقہ مست۔ غیر مسلح یا نیم مسلح۔ غیر تربیت یافتہ فرانس کا زعم ہے کہ اس کی شجاعت۔ فوجی تعلیم اور تجربہ کے ہاتھ رن رہا۔ عرب کہتا ہے کہ فرانسیسی رشوت نے محمد بن عبد الرحمٰن کے معتمد بن کو توڑ لیا تھا جنھوں نے عبد القادر مشہور قائد اعظم کی ہدایات کی تعمیل نہ کی اور فرانسیسی گولہ باری شروع ہوتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ غرضکہ جو کچھ بھی ہو یورپ کی شاطرانہ چال میدان تل الکبیر کی طرح یہاں بھی بازی لے گئی فرانس نے اس کو روئے عالم کی فیصلہ کن معرکوں میں شامل کر کے اپنی شجاعت و تہور میں چار چاند لگا دیئے ہیں اس میدان میں اس وقت چند جھونپڑیاں خانہ بدوش بربر کی پڑی ہوئی ہیں کسی زمانہ میں یہاں ایک قریہ تھا جسکا نام صرف الاخضر تھا لیکن اب کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ البتہ فرانس نے اپنی فتح و نصرت کی یادگار میں ایک تختی اس مقام پر نصب کر رکھی ہے۔

یہ معرکہ ۱۵ اگست ۱۸۴۴ء کا ہے۔

اگادیر

دوران قیام مراکش میں دوسوسی تجار نے جن سے سرسری ملاقات ہوگئی تھی مجھے تارودنت اور اگادیر جانے کی صلاح دی تھی لیکن نہ میرے پاس وقت تھا اور نہ سرمایہ کہ یہ طولانی سفر اختیار کرتا۔ اور اگر وقت اور مصارف کا انتظام اپنے پروگرام کو کتر بونت کر کے کر بھی سکتا ہوتا تو دوصد میل کے ناہموار خام راستہ پر موٹر لاری۔ اونٹ خچر کی سواری کے مصائب برداشت کرنے کی طاقت میرے نحیف جثہ میں نہ تھی۔ اس لئے ان ہردو مقامات کی زیارت سے محروم ہی رہنا پڑا۔ اور وہاں کے قصص رزمیہ (خاندان سعدی کے سوئین فرمانروا ابوعبداللہ محمد کا اپنے ولی عہد سلطنت کو بھیجکر پرتگالیوں کو ۲۰ روزہ جنگ میں شکست فاش دینا۔ نصاریٰ کی فراری اور پرتگالی شہزادی دونا منشیا نامی کا حرم سلطانی میں داخل ہونا) زبانی سن کر دل ٹھنڈا کر لیا۔

اگادیر کا نام انگریزی اخبار خواں کے ذہن میں قیصری حملہ کے سلسلہ میں ضرور ہوگا۔ کہ ۱۹۱۱ء میں قیصر جرمن نے "منطقہ حارہ میں ایک قطعہ آراضی" پر قبضہ کرنے کے لئے ایک جہاز پنتھر نامی کو کس طرح بھیجا لیکن فرانس۔ اطالیہ۔ انگلستان کی سازش سے کس طرح بے نیل مرام واپس جانا پڑا۔ لیکن ملک الجزائر کے شہر تلمسان کے مضافات میں ایک ہمنام مقام کے کھنڈرات دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا تذکرہ بشرط حیات سفرنامہ الجزائر میں کیا جائیگا اگادیر بربری پراکرت کا لفظ ہے جس کے معنی گڈھی۔ قلعہ۔ یا حصن کے ہیں۔

سجلماسہ

منجملہ چند مایوسیوں کے جو سیاحت مغرب میں مجھے پیش آئیں ضلع تافلالت کے قدیم ویران۔ تاریخی مستقر شہر سجلماسہ کی حسرت دید بھی ہے۔ میں اس شہر کی زیارت کا بہت متمنی تھا اور قصر السوق اور بودنیب سے یکصد روپیہ ٹکٹ ٹکسی کو دینے کے لئے تیار بھی تھا لیکن ۱۹۳۱ء میں وہاں بد امنی تھی۔ قافلہ بند تھے اور بجز فرانسیسی فوج یا ان کے جاسوسوں کے راستے مسدود تھے میں نے شہر مکناسہ میں بھی کوشش کی تھی کیونکہ ضلع مکناسہ کی ماتحت میں ضلع تافلالت ہے لیکن چونکہ مارشل لا جاری تھا اس لئے سعی ناکام رہی۔

مکناسہ اور نیز فاس وغیرہ میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر سجلماسہ بالکل منہدم اور ویران ہو گیا ہے۔ وہاں کے عالی شان قصور و حصن۔ مساجد۔ حمام۔ کارخانہ کاروان سرائے ...... زمین دوز ہو گئی ہیں۔ منہج دار و کی طرح مٹی کا ڈھیر جمع ہو گیا ہے لیکن چونکہ علاقہ زرخیز ہے اس لئے "شرفا" کی بستیاں یعنی "قصور" تعداد کثیر میں منتشر ہیں۔ جو کھجور انگور وغیرہ کی تجارت سے گذر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں کی بعض بستیوں میں چمڑا بھی بہت عمدہ پکایا جاتا ہے جس میں خاص قسم کی نفیس خوشبو ہوتی ہے۔ موجودہ سلطان مغرب کا خاندان بھی اسی ضلع میں آباد تھا اور اسی وجہ سے اس ضلع کی مناسبت سے "فلالی" خاندان یا فلالی سلاطین کہلاتے ہیں۔ میں نے یہاں کی کھجور مغرب کے متعدد شہروں میں کھائی۔ تونس اور قیروان میں بھی سجلماسہ کی کھجوروں کے "ڈبے" فروخت ہوتے ہوئے دیکھے۔

تارودانت

یہ شہر ضلع سوس کا مستقر ہے اور بقول بعض مورخین حضرت عقبہ بن نافع نے اسی ضلع کے ایک سرحدی مقام پر اپنا گھوڑا سمندر میں ڈالا تھا لیکن بُعد مسافت کی وجہ سے کہ مراکش سے یکصد میل کے فاصلہ پر واقع ہے میں نہ جاسکا مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ قانون اسلحہ کا نفاذ ابھی تک یہاں نہیں ہوا کیونکہ پورے طور سے یہ ضلع رام نہیں ہوا ہے

سیاحت مغرب کا خاتمہ

نقل خط موسومہ مخدومی و مکرمی عالی جناب معلی القاب مولانا مولوی شکر اللہ صاحب سہیل

ریونیو و فنانس سکرٹری محکمہ صرف خاص دصیغہ ڈیوڑھی خاص اعلحضرت فرمانروائے بھوپال۔

گذشتہ ہفتہ مکناسہ سے ایک عریضہ ابلاغ خدمت کر چکا ہوں۔ آج اس وقت کہ چار بجنے والے ہیں میں اسٹیشن وجدہ پر رخت سفر لے کر آگیا ہوں اور چونکہ ریل گاڑی یہیں سے بنتی ہے اس لئے ڈبہ میں آکر بیٹھ گیا ہوں۔ حالانکہ ریل چھوٹنے میں ابھی دو گھنٹہ باقی ہیں۔ آج ملک مغرب کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ جدائی کے خیال سے طبیعت بے کیف ہے۔ دل کو قرار نہیں۔ کاش ریل پھر فاس کی طرف رُخ کرے اور میں مراکش کو نخلستان معمورہ کی مرغزار جبل اطلس کے برفستان میں پریشان حال پھرنے لگوں۔ کبھی وادی زرہون میں مولائی ادریس کی جاروب کشی کروں اور کبھی یوسف بن تاشفین کی آستین بوسی سے بہرہ اندوز ہوں۔ کبھی حلقہ عیسویہ کے حال وقال سے وجد میں آجاؤں اور کبھی درگاہ سیدی حسین سلاوی میں جاکر پاتراب سفر باندھوں۔ کھنڈرات اغمات میں معتمد کے

مرثیہ سے دل کی بھڑاس نکالوں اور ابن الخطیب کی تودہ خاک پر بیٹھ کر فلسفہ تاریخ کا درس لوں
اختلاج ترقی پر ہے ....
....
....
.... ٹرین کے ڈبے ایک ایک کر کے شمار کر چکا پلیٹ فارم کی پیمایش کئی بار کر چکا
اخبار والہ کے مصور فرانسیسی رسالے الٹ پلٹ کر دیکھ چکا۔ بیاض پٹک دی۔ نقشہ کی کتاب
پھینک دی۔ آخر دل کسی طرح نہ بھلا تو کاغذ گودنے کے لئے نکالا۔ قلم ہاتھ میں لیا کہ کسی ہموطن
کو پریشان کروں۔ تصور نے معاً آن مخدوم کی شبیہ مبارک سامنے کردی بسم اللہ کر کے قلم سنبھالا

بفرست بہ آں نگار کاغذ بنویس دلا بہ یار کاغذ

لیکن حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ کیا یہ مضمون حوالہ قلم کیا جائے۔
"آج مغرب اقصیٰ کی سیاحت ختم کر کے تلمسان جا رہا ہوں ....
.... میں بخیریت ہوں .... فقط والسلام"
دل نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس میں سلا کے کارنامہ شلہ کی داستان حسرت واندوہ۔
زرہون کی کشف و کرامات۔ مکناسہ کی نیرنگیاں تو درج ہی نہیں ....
.... لیکن اس کی فرصت بھی تو نہیں۔
....
ہاں خوب یاد آیا .... خم خانہ ڈھاکہ میں جو مجھ پر بیتی ہے وہ کیوں نہ لکھ ڈالی
جائے کیونکہ اُس بزم کے لئے کہ جس کے رکن رکین بنے خاں جیسے زندہ دل جگت استاذ ہوں*
اس سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ مگر اندیشہ ہے کہ نخلبند گلشن طریقت سالار شاہراہ
حقیقت حضرت آقائی و مولائی مولانا ضیاء الدین صاحب دام فیوضہ کے ہاتھ اگر یہ نامہ سیاہ

*افسوس یہ بلبل ہزار داستاں ماہ اپریل ۱۹۳۲ء میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
آناں کہ بصد زبان سخن می گفتند
آیا چہ شنید ندکہ خاموش شدند

پڑ گیا تو پارہ پارہ کر ڈالیں گے۔ احباب بُرا بھلا کہیں گے اور سب سے زیادہ ناظم احکام شریعت غرا مدیر مہام ملت بیضا مکارم کونین حاجی حرمین شریفین حضرت آقائی و مولائی مولانا مولوی محمد حسین صاحب قاضی القضاۃ ریاست عالیہ بوجہ ان تعلقات نیازمندی کے جو والد مرحوم کے زمانہ سے قائم ہیں۔ سرزنش و تنبیہ کریں گے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن کیا کروں۔ فاتحان اندلس کے ہر شعبہ زندگی کا میں دلدادہ ہوں۔ خواہ طنجہ ہو یا فضحالہ۔ مراکش ہو یا تو زرت بسکرہ ہو یا قیروان میں نے حتی الامکان مغربی معاشرت کو ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کی اور چاہتا ہوں کہ مراکش کے ایک معمولی جلسہ کی سرگذشت پیش کروں۔

مگر دیوانہ خواہم شد دریں سودا کہ شب تا روز　　سخن با ماہ می گویم۔ پری در خواب می بینم

....

....

عربی جلسۂ رقص

بیا اے عشق رسوائی جہانم کن کہ یک چندے
نصیحت ہائے بے درداں شنیدن آرزو دارم

شہر مراکش کے باب الدکالہ کے قریب جبل اطلس اور زاب بوسعدہ کے قبیلہ اولاد نائل کے بعض افراد آباد ہیں جن کے رقص و سرود پر یورپی و امریکانی سیاح اس درجہ فدا ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان کی سحر سامری میں گرفتار ہونے سے بچ رہا ہو۔ میں چونکہ ان کی مجالس کا تماشہ فضحالہ و طنجہ میں دیکھ چکا تھا اور رقص سیف۔ کبک خرامی اور نالہ عندلیب کے مزے لے چکا تھا اس لئے جب اس مخزنی شہر میں اپنے قیام کی آخری رات کھانے کے بعد ہوٹل ہیمونیہ کے دیوان خانہ میں ایک مرقع کی اوراق گردانی کے وقت ایک ملازم ہوٹل نے عربی جلسۂ رقص میں چلنے کے لئے عرض کیا تو انکار کر دیا کیونکہ دن بھر کی دشت نوردی

نے مضمحل کر دیا تھا وہ سن کر چلا گیا اور میں تصاویر سے دل بہلانے لگا۔ دس بجے کے قریب جب کمرہ میں جا رہا تھا تو جنتہ ہیمونیہ پر چاند کو کھیت کرتے ہوئے دیکھ کر خیال آیا کہ معلوم نہیں اب یہاں کبھی آنا بھی ہوگا۔ آؤ اس نخلستان کا چکر لگاتے چلیں چنانچہ اس نیت سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ عالم لاپروائی میں ایک روش کے کنارہ قدم ڈال رہا تھا کہ دو ولّیل رونما ہوئے اور ایک باتصویر پروگرام دکھلا کر دارالضیافت میں چلنے کی ترغیب دی لیکن جب میں نے اپنی لاپروائی۔ غریب الوطنی اور روانگی کے عذرات پر معافی مانگی کہ۔ ع۔ خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است، تو عربی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی ع چوں کوئے دوست ہست بہ صحرا چہ حاجت است، کی سپر مقاومت لے کر بڑھے کہ باغ کی سیر سے کہیں زیادہ فرحت ملے گی۔ ایسا جلسہ کہیں دیکھنے میں نہ ملے گا۔ بالآخر ان کی دلآویز باتوں اور حسین مرقع نے اس قدر محو کیا کہ قہوہ خانہ افرنجہ کی خوشنما عمارت سامنے آگئی لیکن میں پھر سنبھلا۔ رات کا وقت۔ پردیس کا معاملہ۔ اجنبی آدمیوں کا ساتھ۔ فضول خرچی۔ صبح کی روانگی کا تصور کر کے رُکا............ جھجکا............ سما........

.... ان کو دفع کیا اور خود قہوہ خانہ میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں غائب ہو گئے اور میں برف کی ایک طشتری سے دل ٹھنڈا کرنے لگا لیکن ابھی طشتری صاف بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک خوشرو۔ بلند قامت۔ خوش پوش۔ خوش آواز مغربی نے گٹ ٹپنگی اور ایک ممتاز۔ پاکیزہ بلند پایہ محفل کی تعریف میں اس قدر قصیدہ خوانی کی کہ قالب نیم مردہ کو اپنا سوگوار و غمگین دل نذر دعوت مژگان کرنا ہی پڑا۔ اس بربری نے اس جلسہ کی تمہید بڑی شان سے اٹھائی اور اپنی خوش چلنی کے اسناد میں انگلستان کے اُمرا۔ فرانس کے شوقین۔ جرمنی کے تجار کے پروانہ ہائے خوشنودی پیش کر کے مجھ کو...... آخر کار قہوہ خانہ سے اٹھا ہی لیا۔

وقت عزیز رفت بیا تا قضا کنم　　عمرے کہ بے حضور صراحی و جام رفت

لیکن میں نے تنہا جانا پُرخطر سمجھکر احمد جلولی کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہا۔ چنانچہ قہوہ خانہ سے نکلکر باب الفتوح کے قریب سوق منصور میں پہنچکر ان کے مکان پر دستک دی۔ اتفاق سے وہ جاگ رہے تھے اور اپنے مہمان کے ساتھ گپ بازی میں مصروف تھے میں نے اپنی روداد بیان کی۔ انھوں نے تامل کیا لیکن بربری بلبل مغرب نے کچھ اس آن بان سے گفتگو کی کہ وہ بھی راضی ہو گئے۔ اپنے آدمی کو بھیجکر دریافت کیا کہ محفل میں کتنی دیر ہے بربری نے دس پندرہ منٹ میں واپس آکر وہاں کی تیاری بقول فیضی۔

بادہ در جوش است و زنداں منتظر　　ساقیا خذ ما صفا دع ما کدر

کچھ اس انداز سے بیان کی کہ یہ ننگ خاندان اس عہد و پیمان کو جو سال گذشتہ ایک عظیم الشان دربار میں کر چکا تھا پارہ پارہ کر کے احمد کے ساتھ کوئے خرابات کو نکل کھڑا ہوا اور شارع بنی مُرہ کے مکان ۲۲ کو عارضی سجدہ گاہ بنا لیا۔

اس چھوٹی خوشنما حویلی کے دروازے پر ایک خوشرو بربری دربان کو دیکھکر کسی قدر جرارت ہوئی لیکن پھر بھی قدم لڑکھڑا گئے۔ بدن پر رعشہ پیدا ہو گیا حلق میں کانٹے پڑ گئے میں ٹھٹکا۔ مگر احمد کی ہمت افزائی پر کہ

ایں خرابات مغان است درو زنداں اند　　شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ذرا تقویت ہوئی اور ہم دونوں ڈیوڑھی سے گذر کر چھوٹی سی انگنائی میں پہنچے جس میں نارنگی کا درخت لدا کھڑا تھا۔ پاس ہی حوض کے کنارہ ایک بیل جعفری پر چڑھی ہوئی تھی۔ انگنائی سے نکلکر بالاخانہ کے ایک متوسط کمرے میں پہنچے جو مراکش کے چرمی تکیوں سوسن کے اطلسی پردوں اور قیروان کے قالین سے سجا ہوا تھا۔ یہاں تین نوعمر رقاصہ

عذرا۔ حمرا۔ سلمیٰ سادہ مغربی لباس میں نظر پڑیں۔ کلائیوں میں مکناسہ کی بھدی موٹی چوڑیاں گلے میں زرہون کی نادعلیاں۔ سر پر فاس کے ریشمی خمار پڑے تھے۔ خط وخال میں عربی جھلک کتابی چہرہ۔ ستوان ناک۔ چھریرا بدن۔ صراحیدار گردن۔ بادامی آنکھ معمولی سلام علیک کے بعد ہم دونوں بیٹھ گئے۔ ذرا دیر میں ایک شاندار کھنک دار آواز نیچے سے آئی۔ ایک منٹ بعد ایک سرو قامت سیاہ چشم۔ نازک اندام۔ غزال رعنا۔ از سرتاپا تونسی گھیر دار لباس میں مکلف رونق افروز انجمن ہوئی۔ میں یورپی حسن بے نقاب کے صدہا جلوے دیکھ چکا تھا۔ مصر وٹرکی کی مشرقی لچ وتی کے حجاب کا لطف قسطنطنیہ۔ شام ومصر میں اٹھا چکا تھا۔ لیکن ایسا لالہ صحرا کہ جس پر۔ ع حور شبیہی۔ ہوش ربائی شکل پری درصورت انسان۔ کا اطلاق ہوتا ہو۔ آج ہی دیکھنے میں آیا۔ افسوس کہ فرانسیسی مشاطگی کا یہ بھی شکار ہو چکی تھی۔ انگلیاں فرانسیسی ناخون گیر کی مرہون منت ہو چکی تھیں جس نے گاودم تراش کر مرجان پیرس سے خونیں کر دیا تھا۔ لب باسمیں سرخ پنسل سے خونچکاں تھے۔ غنیمت تھا کہ چشم مخمور فرانسیسی کحل کے بجائے مشرقی کاجل پر قناعت کئے ہوئے تھی۔ اس کی شاہانہ چال۔ کھنکدار آواز۔ انداز نشست وبرخاست شاہد تھی کہ اُس کو دولت حسن اور کمال فن پر ناز ہے۔ ایک آن دلربائی اور شان رعنائی سے داخل ہوئی اک موج تبسم کے ساتھ مسرت افزا سلام علیکم کر کے ساری محفل پر چھا گئی۔ قرینہ سے بیٹھی مگر اپنی سہیلیوں سے ایک دو بالشت آگے۔ ساتھیوں سے رسمی مزاج پُرسی کے بعد میری ہیئت کذائی دیکھی اور جب اندلسی نغمہ وسرود سے میری دلچسپی اس پر آشکارا ہوئی تو نرگس شہلا جس کو محمد جاسئی اپنے لاجواب دوھہ سے دولت جاوید کا تمغہ عطا کر چکا ہے رقص میں آگئی لب نازک جنبش میں آئے اور السنہ افرنجہ میں خوابیدہ وفراموش کردہ اشبیلی وغرناطی ساز پر مغربی مضراب لگانے کی نوید روح افزا سے تن مردہ میں جان ڈال دی۔

پہلے قہوہ کا دور ہوا۔ تلخ۔ سیاہ۔ تلچھٹ دار مغربی قہوہ مجھے کبھی پسند ہی نہ ہوا۔ اسپر فرانسیسی قہوہ کا اشارہ ہوا اور اگرچہ میں انکار کرتا رہا لیکن توبہ شکن زلیخا کے پنجہ حنائی نے "قہوہ باللبن" کے چھلکتے ہوئے پیمانہ سے زہد و ورع کا شیش محل جسے میری ابلہ فریبی اور احباب کی ستائش بیجا نے "حصار کوہ پیکر" بنا رکھا تھا چور چور کر ڈالا۔

بتے چوں ماہ زانو زد　　مئے چوں لعل پیش آورد

تو گوئی تائبم حافظ　　ز ساقی شرم دار آخر

اب حمرا اور سلمیٰ اُٹھیں اور نقرئی پٹیاں باندھ کر کمالات رقص دکھلانے لگیں۔ عذرا اور زلیخا اپنی جگہ پر تالیاں بجاتی رہیں۔ یہ رقص مشرقی و مغربی کمالات کا معجون مرکب تھا کبھی زقند لگا کر ٹخنہ جبیں بوس تھا اور کبھی ہاتھوں کو پس پشت لے جا کر کمند افگنی کا نقشہ پیش کیا جاتا۔ زلیخا کی باری آخر میں آئی جس وقت جیپر اس کس کر گھیردار کپڑوں کو سمیٹ کر صاعقہ نوازی کے لئے کوندی تو کمرہ جگمگا اٹھا۔ پاولوا کی برق خرامی۔ انینتہ کی کجرفتاری اور کینیڈی کی ناوک فگنی بادیہ نشین مغرب کی ایک الھڑ۔ نادان اور غیر ترتیب یافتہ بربری چھوکری میں کیونکر پیدا ہوگئی۔ محلہ بنی مرہ میں روسی اوپیرا کے کمال کیونکر پھٹ پڑے۔ اشبیلیہ کی کبک دری صحرائی مراکش میں کہاں سے آگئی۔ کجا اندلس کی نای و نوش اور کجا مغرب کا حال و قال۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

لیکن للکو بی کے دقایق اس ہندی کے فہم و ادراک سے بالاتر تھے جو متعدد طواف یورپ کے باوجود بدقسمتی سے اس فن لطیف سے بیگانہ ہی رہا اور جو دائرہ رقص میں تماشہ بیں کی طرح پھر پھرا کر جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس وہ آگیا۔ البتہ جس وقت عربی

زمزمہ سنجی ہوئی تو دل گرما گیا۔ سیدہ منیرہ مہدیہ۔ سیدہ رتیبہ اور عبدالوہاب موسیقار کے گانے شام و مصر میں سن چکا تھا لیکن کجا یا آپ تو ما و ازبکیہ کے ہنگامہ محشر خیز اور کجا دُو کالہ کی خلوت گاہ راز۔ رات کا وقت خموشی کا عالم۔ بے تکلفی کی محبت۔ فاسٹر فریزر نے جس جلسہ کا نقشہ اتھنرس کلب لندن میں کھینچا تھا وہ غالباً یہی ہوگا۔ زلیخا کی آواز بلند نہ تھی لیکن دل کے پار ہو رہی تھی تحت اللفظ کی طرح ایک مصرع پڑھا نہیں کہ دل میں اُتر گیا۔ بتانے کا طریقہ سرے سے غائب ہے۔ مصرع کو ایک بار خوش الحالی سے پڑھ کر سنا دینا کافی ہے پھر دم لے کر دوسرا مصرع سنا دیا اور شعر ختم ہو گیا۔

متعدد نغمے سُنائے گئے اور سنے گئے جن میں سے بعض کو میں نے ٹانک لیا تھا لیکن اس وقت صرف سات اشعار محفوظ مل سکے۔

بدت لی تزنو بالعیون الفواتر　　　ولکن لها فی القلب وقع البواتر

بدات لی وفی قلبی المعنی بحبها　　　لواعج اشواق کحر الجواهر

....

....

....

....

وحسنك النسانی محاسن کاعب　　　علقت بها قد ماحقرت لها البدرا

ولیس ببدع وهولا ریب یوسف　　　وکل زلیخا والبلاد عذت مصرا

....

....

یا اهل اندلس لله درکم　　　ماء وظل وانهار واشجار

ماجنة الخلد الا فی دیارکم　　　ولو تخیرت هذا کنت اختار

لا تحتشوا بعد ذا ان تدخلوا سقر   فلیس تدخل بعدا الجنۃ النار

میری زبان سے نکلا کہ ہندوستان کی طرح پاٹ دار آواز غالباً مغرب میں عنقا ہی۔ اسپر بلا میری درخواست کے ایک فرانسیسی نغمہ شروع ہوگیا۔ نظم حسب معمول مشرقی سوز و گداز سے معرا تھی لیکن آخری مصرع کے آخری لفظ پر اس قدر پاٹ دار فلک شگاف تان دیر تک کھنچی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دم توڑ کر طائر روح پرواز کر جائیگا۔ حیرت تھی کہ ابھی جن لبھائے یاسمین کی نزاکت سخت آواز کی متحمل نظر نہ آتی تھی ان میں اتنی طاقت کیسے پیدا ہوگئی کہ سقف چنبری کو چھید ڈالا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مکان دہل گیا۔ پیرس اور روما کی سُپرالو بھی اتنی بلند پرواز ہونگی۔ میں نے فارسی اشعار لکھکر دیے لیکن اُن کے لئے پڑھنا دوبھر تھا۔ اردو کے چند اشعار لکھکر دیے مگر جب احمد ہی ٹھوکر کھانے لگے تو جبل اطلس کی اولاد نائل کیونکر ہجے کر سکتی تھیں دو بجے تک یہ جلسہ گرم رہا۔ مسمریزم کے دو شعبدے بھی دکھلائے گئے۔ اس کے بعد میں اٹھا اور ایک رقم نذر کرکے "بان ویاژ" کی خوش آیند الوداع سنتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور اپنے کمرے میں پہنچکر نیم احمق۔ بیحد آشفتہ حال۔ خجل و شرمسار پلنگ پر گر پڑا۔ ساری دن کی کوفت پر اس شبینہ کا خیال کر کے خفت و پشیمانی سے سر اٹھایا نہ جاتا تھا۔ اپنے آپ کو ملامت کرتا توبہ و استغفار کر کے آیندہ تائب رہنے کا عہد کرتا۔ اسی اُدھیڑ بن میں تین بج گئے اور پلک نہ جھپکنا تھی نہ جھپکی مجبوراً پلنگ پر سے اُٹھا۔ یادداشت لکھنا چاہی مگر قلم نہ چلتا تھا۔ پھر گرا۔ نیند بلانا چاہتا تھا مگر آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ کسی مشکل مسائل پر غور کرنا چاہا مگر طبیعت یکسو نہ ہوتی تھی۔ سرور کے اشعار سے دل کو تھپکیاں دینا چاہا مگر دماغ میں کوئی اور شے بسی ہوئی تھی۔ غرض لاکھ جتن کر ڈالے مگر نیند حرام تھی۔ گھڑی نے چار بجائے اور شفاخانہ مرشان کی مختصر مسجد سے الصلوٰۃ خیر من النوم کی آواز بلند ہوئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ گناہوں

کی مہیب شکل سامنے آگئی حسن وجمال کے جلوے غائب۔ دیو واژدر کی خوفناک شکلیں بڑھنے لگیں۔ خوف سے آنکھیں بند ہوگئیں۔ بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ غیرت مذہبی نے شرم دلائی اُٹھا۔ وضو کیا اور بواب سے دروازہ کُھلوا کر اُس بارگاہ غفور الرحیم میں کہ جس کا دریائے کرم ہمیشہ موجزن رہتا ہے لرزاں وگریاں حاضر ہوا۔ یہ پہلا دن تھا کہ مجھ کو مغرب اقصیٰ میں نماز صبح باجماعت کی سعادت حاصل ہوئی کیونکہ اگر کبھی آنکھ کھل بھی جاتی تھی تو سردی میں کمرے سے چار بجے فجر کو دکہ مالکی مذہب والے اسی وقت نماز فجر پڑھتے ہیں) نکلنے کے لئے سینکڑوں بہانے نفس اختراع کر لیا کرتا تھا۔ الحمد للہ کہ مسجد میں پہنچکر اطمینان قلب فی الفور حاصل ہوگیا لیکن اسکا کیا علاج کہ سنتوں کے بعد غنودگی کے جھونکے شروع ہوگئے۔ اپنے آپ کو زجر و توبیخ کرتا۔ چونکتا۔ لاحول پڑھتا لیکن پھر اونگھ جاتا۔ آخر تکبیر سنائی دی۔ امام صاحب نے نیت باندھی اور سورہ سبح اسم ربک الاعلیٰ اور والفجر ولیال عشر کی خوش آیند قرا‌ءت کے بعد فرض ختم ہوئے۔ اور تو کسی نے نہیں لیکن میں نے سجدے میں گر کر دعا مانگی معلوم نہیں دل نے کیا چاہا اور زبان سے کیا نکلا۔ آنکھوں میں اشک۔ لب پر توبہ۔ جسم پر لرزہ۔ سراپا تقصیر۔ سراپا گنہگار اُس مجرم کے مانند جو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کیا گیا ہو میں اس احکم الحاکمین کے دربار میں حاضر تھا۔ سر جانماز میں گڑا جاتا تھا معلوم نہیں دعا کیا مانگی اور کب ختم ہوئی۔ نمازی کب گئے اور میں کتنی دیر میں اٹھا لیکن جب اٹھا تو دو مصلیوں کے سوا مسجد سونی تھی بہرحال اُٹھا اور سلام کرکے شرمسار و سوگوار لڑکھڑاتا ہوا قیامگاہ پر پہنچا۔ اور کوٹ پھینکا۔ اوندھا گرا اور روتے روتے بیدم ہو گیا

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن
بر حال و دل اسیر من رحمت کن

بر پائے خرابات روِ من بخشائی
بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

طالب رحمت۔ ولی محمد

(نوٹ) یہ خط اسٹیشن ووجدہ پر شروع کیا تھا لیکن روانگی کے بعد حرکت ریل مانع تحریر ہوئی تلمسان میں قلقلی اور نیز اسرائیلی بزم آرائیوں نے لکھنے کی مہلت نہ دی۔ سدی بوالعباس اور وہران میں غم وغصہ سے نجات نہ ملی معسکر میں ختم ہوا اور مستغانم کے ڈاکخانہ سے روانہ کیا۔

تمام شد سفرنامہ مغرب اقصیٰ

مفید معلومات

نام | جس ملک کی سیاحت اوراق مذکورہ بالا میں کی گئی ہے اُس کا اصل نام "مغرب اقصیٰ" ہے نہ کہ "میرک" یا "مورک" یا "مورکوس" یا "مراکو" جیسا کہ باشندگان فرانس ۔جرمنی۔ اسبانیہ وانگلستان علی الترتیب غلط طور پر کہتے ہیں۔ اس ملک کو جو افریقہ کے انتہائی شمال وغرب میں واقع ہے اردو زبان میں "مراکو" کہنا ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ ہندوستان کو "انڈیا" ایران کو "پرشیا" یا مصر کو "ایجپٹ" کہنا۔

رقبہ | مغرب اقصیٰ کا مجموعی رقبہ فی زمانہ دو لاکھ اٹھارہ ہزار میل مربع ہے جس میں سے دو لاکھ میل مربع زیر سیادت وماتحتی فرانس ہے۔ اٹھارہ ہزار سے کچھ کم زیر نگیں اسبانیہ اور ۲۲۵ میل مربع متعلقہ طنجہ زیر انتظام انجمن بین الاقوامی ہے۔

بلحاظ رقبہ انگلستان سے چہار چند۔ جرمنی سے ۱½ گنا۔ اسبانیہ وصوبہ آگرہ واودھ سے دوچند۔ ریاست حیدر آباد سے کچھ کم سہ چند بڑا۔ اور موجودہ جمہوریہ ترکی اور ملک فرانس سے مساوی مساوی ہے۔ طنجہ کا رقبہ ریاست کدورہ باونی یا ریاست کھلچی پور کی برابر برابر ہے۔

آبادی | لیکن خانہ جنگی اور یورپی پیشقدمی سے ویران سا ہو گیا ہے۔ آبادی ۵۴ لاکھ نفوس سے زائد نہیں یعنی مقابلتہً ریاست حیدر آباد سہ چند زائد آباد ہے۔ ریاست میسور کی آبادی بھی زائد ہے صوبہ آگرہ واودھ تقریباً دس گنا صوبہ پنجاب چہار چند۔ ترکی سہ چند۔ ملک فرانس سات گنا زائد آباد ہیں۔

خاص خاص شہر | ذیل میں ملک مغرب اقصیٰ کی خاص شہروں کی آبادی سالانہ تذکرہ مرتبہ دفتر افسر اعلیٰ نظام حکومت فرانسہ سے اخذ کی گئی ہے کہ جسکو سال پیوستہ فرانسیسی حکومت نے میرے پاس بھیجا تھا

ماتحت	نام شہر	میزان آبادی	مسلمان	یہود	نصاریٰ	کیفیت
زیر حمایت فرانس	مراکش	۱½ لاکھ	۱لاکھ ۳۳ہزار	۱۴ہزار	۳ ہزار	اوسط بارش ۱۸، انچہ
	دارلبیضا	۱لاکھ ۶ہزار	۵۳ ہزار	۱۹ ہزار	۳۴ ہزار	اہل یورپ اسکو کازابلانکا کہتے ہیں
	فاس	۸۱ ہزار	۷۱ ہزار	۷ ہزار	۲ ہزار	اوسط بارش ۳۲ انچہ اہل یورپ اسکو فیض کہتے ہیں
	رباط الفتح	۳۸ ہزار	۲۱ ہزار	۴ ہزار	۱۳ ہزار	اوسط بارش ۳۲، انچہ
	مکناسہ	۳۰ ہزار	۱۹ ہزار	۴ ہزار	۱۳ ہزار	اوسط بارش ۳۲، انچہ
	اسفی	۲۷ ہزار	۲۲ ہزار	۳½ ہزار	۱½ ہزار	اہل یورپ اسکو سافی کہتے ہیں
	سلا	۲۰ ہزار	۱۸ ہزار	۱ ہزار	۱ ہزار	اوسط بارش ۳۲ انچہ اہل یورپ اسکو سلی کہتے ہیں
	الجدیدہ	۱۹ ہزار	۱۴ ہزار	۴ ہزار	۱ ہزار	اہل یورپ اسکو میزیگن کہتے ہیں
	الصویرہ	۱۹ ہزار	۱۰ ہزار	۷½ ہزار	۱½ ہزار	اہل یورپ اسکو موگیدور کہتے ہیں
	وجدہ	۱۹ ہزار	۹½ ہزار	۱ ہزار	۸½ ہزار	
	وزّان	۱۳ ہزار	۱۱ ہزار	۱½ ہزار	۶۰۰	
	تازا	۱۰ ہزار	۷½ ہزار	½ ہزار	۲ ہزار	
زیر حمایت ہسپانیہ	تیطوان	۲۴ ہزار	۱۳ ہزار	۵½ ہزار	۶½ ہزار	
	سبتہ	۱۰ ہزار	۴ ہزار	۱ ہزار	۵ ہزار	
	العرائش	۱۵½ ہزار	۷½ ہزار	۲ ہزار	۶ ہزار	
	القصرالکبیر	۱۲½ ہزار	۱۰ ہزار	۱ ہزار	۱½ ہزار	
	اصیلا	۳ ہزار	۱½ ہزار	۱ ہزار	۱ ہزار	اہل یورپ اسکو ازریلا کہتے ہیں
زیر انتظام مجلس بین الاقوام	طنجہ	۶۰ ہزار	۳۵ ہزار	۱۵ ہزار	۱۰ ہزار	اوسط بارش ۳۵، انچہ

دریا ملک مغرب کے خاص خاص دریا حسب ذیل ہیں

(۱) **ام الربیعہ**۔ یہ اس ملک کا دریائے گنگ ہے جو جبل اطلس وسطی سے نکلکر، ۳۰۰ میل کی مسافت میں دار اولاد زیدو۔ زاویہ ترمست بولعون کی پابوسی کرتا ہوا۔ شہر ازمور کے متصل بحر اطلانتک میں غرق ہو جاتا ہے۔ پہاڑی او نشیبی علاقہ کیوجہ سے دھار تیز بہتی ہے لیکن گہرائی کسی جگہ ۴۔۳ گز سے زائد نہیں ہے۔ بحر اطلانتک کے قریب اسکا دہانہ ۱۱ گز عریض ہو گیا ہے۔

(۲) **وادی ملویہ**۔ اس کا منبع بھی جبل اطلس وسطی ہے۔ مقامات نعور۔ رہبیلہ۔ بولیقوب۔ مرادہ مولائی الباشا کے پاس سے گذرتا ہوا ۲۵۰ میل کی مسافت کے بعد بحر روم میں گرتی ہے۔ پاٹ بعض جگہ ایک سو گز تک پھیل گیا ہے۔

(۳) **وادی تان سیفت**۔ یہ ایک مختصر ندی ہے لیکن ملک کا سب سے بڑا آباد اور گنجان شہر مراکش اسکی قریب آباد ہے۔

(۴) **وادی سیبو**۔ اس کج مج دریا کے کنارے یا قریب حسب ذیل شہر آباد ہیں۔ فاس

حجر الاوقاف۔ ایت بنی ملک۔ سدی علاؤ النازی سیدی محمد بالخیر۔ مہدیہ

اسی دریا میں حسب ذیل چار چھوٹی ندیاں گرتی ہیں۔

وادی اماون۔ وادی وغرا۔ وادی بکس۔ وادی عندم۔

مذکورہ بالا دریاؤں کا مقابلہ ہندوستان کے بعض دریاؤں سے کرو۔

گنگا (۱۵۱۴ میل)، گومتی (۴۸۰ میل)، بینوا (۶۰۴ میل)، ٹمیس انگلستان (۲۱۵ میل)،

سین فرانس (۲۵۰ میل)

پہاڑ سب سے بلند و ممتاز ترین سلسلہ جبل اطلس کا ہے۔ اس کے بعد ریف کا سلسلہ ہی جبل اطلس

میں حسب ذیل بلند چوٹیاں ہیں۔

جبل بوایلان (۱۰ ہزار فٹ) جبل تمجوت لیکوم (۱۳ ہزار فٹ)

جبل رلیف میں سب سے بلند چوٹی تیزی رون ہے جو ۸ ہزار فٹ بلند ہے۔

ہندوستان کی بعض مشہور چوٹیاں درج ذیل ہیں۔

شملہ (۸ ہزار فٹ) نینی تال (۷ ہزار فٹ) سری نگر (۵۲۶۰ فٹ) آبو (۵۶۰۰ فٹ)

لینسڈون (۶ ہزار فٹ)

جنگل | بہت زائد نہیں ہے۔ شاہ بلوط صنوبر۔ عرعر۔ کارک کے جنگل اکثر راستہ میں ملے لیکن نگہداشت اچھی نہیں۔ ارز کا جنگل جبل زرہون پر ہے اور یہی جنگل سب سے زائد قیمتی ہے۔

لیکن بعلبک کا جنگل اشجار ارز بہت بڑا اور بہت مشہور ہے۔

ریل | چھوٹی اور بڑی پٹری کی ریل فرانس نے تعمیر کی ہے اور انھیں ٹھیکوں کی بدولت اسکے قدم جم گئے۔ کل تعداد مسافت ریل سوا دو ہزار کیلومیتر ہے۔

ہندوستان میں ای آئی آر چار ہزار میل اور بی بی سی آئی ای ۲۸۰۰ میل تک پھیلی ہوئی ہے البتہ اسٹیشن بہت اچھی۔ آرام دہ اور شاندار ہیں۔ بعض سٹیشن تو لکھنؤ۔ کانپور۔ ہوڑہ بمبئی سے زیادہ آرام دہ۔ صاف اور خوشنما ہیں۔

زمین | صوبجات شاویہ۔ ابدہ ۔ وکالہ۔ حاحہ کی زمین سیاہ اور بہت زرخیز ہے۔ جبل اطلس کے قریب زمین سُرخ مورم دار ہے۔ صوبہ تافلالت کی زمین ریتیلی ہے اور کھجور کے علاوہ غلہ بھی اچھا پیدا ہوتا ہے۔ گیہوں۔ چنا۔ جو۔ جوار۔ مکا۔ چاول۔ باجرہ۔ کودوں خاص پیداوار ہیں۔ کپاس کم ہوتی ہے۔ مصری کپاس کا تجربہ کیا گیا لیکن ناکام رہا۔

میوہ | سرد ممالک کا میوہ ہر قسم کا بافراط پیدا ہوتا ہے۔ انگور و انجیر کی کثرت ہے۔ انگور تیطوان کے

قریب انجیر کی برابر دیکھنے میں آیا۔ دو دانہ انگور کے ایک ساتھ منہ میں رکھنا محال ہو۔ خربزہ بڑا مثل سردہ کے ہوتا ہے لیکن سردہ سے کہیں زائد شیریں۔ تربوز طائف کی برابر ہوتا ہے فتح گڈھ کی طرح بڑا تربوز نہیں دیکھنے میں آیا لیکن بعض بربر کا یہ کہنا ہے کہ سجلماسہ کی ندی میں بڑا تربوز بھی ہوتا ہے۔ نارنگی سلہٹ کی طرح ڈھیلے خول کی نہیں ہوتی۔ ناگپور کی برابر بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ موسمی طنطا کی طرح سرخ اور یافہ سے زیادہ شیریں وشاداب۔ ناخ اسپانیہ کی اچھی ہوتی ہے لیکن یہاں کی ناخ بھی کو لو کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ گنا کم ہوتا ہے لیکن سہارنپوری گنّے کی طرح نرم نہیں ہوتا۔ بادام۔ آلو بخارا۔ زرد آلو بکثرت۔ انار درعہ کی مانند شیریں لیکن مقابلتہً گراں۔

شکار| حلال جانوروں میں صرف چکارہ دیکھنے میں آیا۔ درندوں میں شیر معدوم ہو چکا ہے تیندوہ صرف جبل اطلس کی طرف ملتا ہے۔ شرف العقاب میں سور کا شکار بلم سے کیا جاتا ہے فضحالہ کے میدانی علاقہ میں نیزے سے خرگوش کا شکار ہوتا ہے۔ عرب و بربر گولی بہت صحیح چلاتے ہیں۔

باشندے| مغرب اقصیٰ کے قدیمی باشندے بربر ہیں لیکن تیرہ سو سال کے عربی اختلاط اور مذہبی مساوات نے سب کو ایک واحد قوم میں منسلک کر دیا ہے۔ البتہ اب چند سال سے کہ فرانسیسی حکومت جاری ہو گئی ہے۔ اہل عرب و بربر میں تفرقہ اندازی پیدا کر دی گئی ہے جمہوریہ فرانس بوقت ضرورت کبھی عرب کو اور کبھی بربر کو بھڑکاتی رہتی ہے۔ عرب سے کہتی ہے کہ تم فاتح وحکمراں ہو لیکن جب بربر سے کام نکالنا ہوتا ہے تو ان کو تسلی دیتی ہے کہ اصلی باشندے تو تم ہو عرب تو غاصب ہیں ان کو نکال باہر کرو۔ عرب و بربر میں شادی بیاہ رائج ہے۔ جمہوریہ فرانس بربر کو ان کی زبان میں تعلیم دلانا چاہتی ہے۔ قوم بربر کی تاریخ

راقم الحروف اپنی جدید تالیف "تاریخ مغرب اقصیٰ" سے واقفیت عامہ کے لئے درج ذیل کرتا ہے۔

"قوم بربر اپنا نسب کنعان ابن حام ابن نوح تک پہنچاتی ہے۔ ان کے جد امجد کا نام مازیغ ہے جس سے دو بڑے گروہ برنس اور مادغیس المعروف بہ ابتر نکلے۔

برنس کی حسب ذیل شاخیں ہیں صنہاجہ۔ کتامہ مصمودہ۔ عجیسہ۔ اوریغہ۔ ازواجہ۔ لمطہ ہسکورہ۔ جزولہ لیکن صنہاجہ بہت ممتاز ہے۔ افریقیہ کے سلاطین بنوزیری اور اندلس و مراکش کے تاجداران ملثمون صنہاجہ سے ہیں۔ افریقیہ اور مصر میں جو عبیدین گذرے وہ کتامہ ہیں مصامدہ میں سے آل غمارہ ہیں۔ سبتہ کا قلعہ دار یلیان اسی قبیلہ غمارہ کا ایک فرد تھا بنی العافیہ کے بعد حکومت ثانیہ میں جو لوگ ادریسیین کے نام سے پکارے گئے وہ بھی غمارہ ہیں تامسنا کے برغوانہ اور جبل درن کے قبائل و متبعین موحدون بھی غمارہ سے ہیں۔

ابتر کے چار ذیلی خاندان ہیں۔ خریسہ۔ نفوسہ۔ اداسہ۔ لواتہ۔ سجلماسہ کے سلاطین مدرار اور فاس کے فرمانروایان بنو ابی العافیہ مکناسہ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ خریسہ سے زناتہ نکلے۔ تلمسان کے ملوک بنو خضر المغراوی زناتہ تھے۔ مغراوہ بھی قبیلہ زناتہ کی ایک چھوٹی لیکن مشہور شاخ ہے۔ تادلا اور سلا کے ملوک بنی یفرن۔ تلمسان کے ملوک بنو زیان اور فاس کے ملوک بنو مرین مغراوہ قبیلہ کے رکن تھے۔"

مذہب عقبہ بن نافع اور موسیٰ بن نصیر کے زمانہ میں سارا ملک مشرف باسلام ہو گیا۔ دوسری صدی ہجری میں خارجی مذہب بہت پھیل گیا۔ لیکن نصف صدی کے بعد اس کا زور گھٹ گیا۔ سنہ ۴۰۰ھ تک مذہب حنفی کا غلبہ رہا۔ اس کے بعد امام مالک کا مذہب پھیلا جو اس وقت تک رائج ہے۔ سلطان وقت مالکی مذہب کا پیرو ہے۔ اثنا عشری بہت کم ہیں تعزیہ داری

مطلق نہیں ہوتی۔ اہل تشیع واہل سنت والجماعت میں وہ اختلاف جو ایران وہندوستان میں رونما ہے یہاں مطلق نہیں۔

پیری ومریدی | اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر شہر ہر قصبہ ہر گاؤں۔ ہر مزرعہ کا قطب جدا، مجذوب جدا، پیر جدا۔ زاویہ جدا۔ درگاہ جدا۔

سلسلہ قادریہ کا بڑا احترام ہے۔ قصبہ صفروی کے ایک قہوہ خانہ میں جب میرے وکیل سے دوچار آدمیوں کو معلوم ہوا کہ میں حاجی ہوں اور میرا سلسلہ نسب حضرت ابا ایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے اور میں سلسلہ قادریہ میں داخل ہوں تو مالک دوکان نے اچھی خاصی دعوت کر دی۔ ہر شخص دست بوسی کرنے لگا۔ حیرت سے پوچھتا تھا کہ کیا لندن میرا مولد ہو۔ اتفاق سے اُس وقت مکہ مکرمہ کی سلی ہوئی شیروانی پہنے ہوئے تھا جس نے سیہ کاریوں کی پردہ پوشی کرلی۔

مغرب اقصیٰ میں حسب ذیل بزرگان دین کا بہت زیادہ احترام ہے۔

حضرت مولائی العربی درقاوی مدفون بہ قریہ لوبرج ضلع فاس

حضرت مولائی عبد السلام مدفون بہ جبل بنی عروس متصل تیطاوین

حضرت مولائی ابو سعید المعروف بہ بوسلہم مدفون بہ وزّان

حضرت سیدہ للہ شفیعہ مدفون بہ فاس (یہ زندہ دفن کردی گئی تھیں)

حضرت سیدہ للہ میمونہ خلیفہ حضرت بوسلہم

سلطان وقت | مغرب اقصیٰ کے سلاطین ابتداً اپنے آپ کو "امیر" کہتے تھے۔ مرابطین وموحدین نے "امیر المسلمین" کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد پھر "امیر" کا رواج ہوا "سلطان" کا استعمال شرفائے فلالی کے وقت سے رائج ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین

سلطان مغرب اقصیٰ" کے القاب کا بھی اضافہ ہوا سلطان وقت سادات حسنی سے ہے۔

مخزن | دارالسلطنت کو "مخزنی" شہر کہتے ہیں۔ مغرب اقصیٰ میں اس وقت چار مخزنی شہر ہیں

اول رباط الفتح کہ جہاں سلطان وقت کی مستقل سکونت رہتی ہے زاں بعد فاس۔ مکناسہ۔

مراکش کا نمبر ہے کہ جہاں بوقت ضرورت و بعد اجازت فرانسیسی حاکم اعلیٰ سلطان جاتا ہے

ہندوستان میں تین مخزنی شہر ہیں دہلی۔ شملہ۔ کلکتہ۔

خلیفہ | خلیفہ کے معنی نائب السلطنت ہیں۔ اسپانوی علاقہ میں (تطاوین شیشوان ملیلیہ سبتہ وغیرہ) ایک خلیفہ منجانب اسپانیہ مقرر رہا کرتا ہے۔ فرانسیسی مغرب اقصیٰ کے تین بڑی شہروں

فاس۔ مراکش۔ تافلالت میں ایک ایک خلیفہ فرانس کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔

باشا | ہر بڑے شہر میں ایک ایک "باشا" فرانس نے مقرر کر رکھا ہے مثلاً فاس۔ رباط۔

تادلا۔ مکناسہ۔ زرہون۔ تازا۔ مراکش۔ صویرہ جس کے فرائض ہندوستانی اصطلاح میں

قاضی و کوتوال و میر مجلس کے ہوتے ہیں۔

محتسب | باشا کی ماتحتی میں ایک عہدہ دار از نام "محتسب" ہوتا ہے جسکو افسر چنگی و نگران بازار

کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔

امین المستفاد | محاصل سرکاری وصول کرنے کے لئے جو محصل ہوتا ہے اس کو امین المستفاد کہتے ہیں

ناظر الاوقاف | اوقاف کی نگرانی ناظر کے سپرد ہے۔

فوج | مغرب اقصیٰ جب آزاد تھا تو سلطانی افواج کی تقسیم حسب ذیل طریقہ پر تھی۔

جیش شراقہ۔ اس پلٹن میں ہر ملک اور ہر قوم کا آدمی بھرتی ہو سکتا تھا۔ ترک

عرب۔ سودانی۔ الجزائری۔ تونسی کے لئے یہ فوج حاضر تھی۔ اسی

وجہ سے اس کا نام شرقیہ تھا جو بگڑ کر شراقہ ہوگیا۔ اسی کی تقلید میں

فرانس کی پلٹن اجانبہ ہے جس کی کارکردگی کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ فرانسیسی پلٹن اجانبہ کا صدر مقام سدی بو العباس ہے جو ملک الجزائر کی ایک مشہور چھاونی ہے۔

جیش بواخیر۔ اس جماعت میں کہ جس کی تعداد گھٹتے گھٹتے اس وقت صرف چار ہزار رہ گئی ہے۔ صرف حبشی اور سودانی بھرتی ہوتے تھے اور چونکہ ان کو صحیح بخاری شریف پر حلف وفاداری لینا پڑتا تھا اس وجہ سے اس کا نام جیش بخاری ہو گیا جس کی مسخ صورت بواخیر ہے۔

اس رسالہ میں ۶ فٹ سے کم کا آدمی بھرتی نہیں ہوتا۔ محل پر انہیں کا پہرہ ہے۔ سلطان کے خدام۔ جامہ دار۔ آبدار۔ بندوقدار اسی جیش سے لئے جاتے ہیں اسے یہاں کا "ہارس گارڈ" سمجھنا چاہیئے۔

جیش شرردہ۔ یہ بربری قبیلہ شرردہ کی جمعیت تھی اور اس کا ایسا ہی زور تھا جیسا حیدرآباد میں عربی جمعیت کا۔

جیش وودایہ۔ اس میں علاقہ کے مغلوب الغضب جنگجو بربر بھرتی ہوتے تھے اور سلطان وقت ہر سپاہی کو "عم" کہتا تھا۔

سپاہی کو مخزنی۔ جمعدار کو مقدم۔ کپتنی کمانڈر کو قائد المیہ اور کمانڈنٹ کو راعا کہتے ہیں۔

اب فی زمانہ فرانس کے ہاتھ میں فوج کا انتظام واہتمام ہے۔ اس وقت فوج کی تعداد ۵۰ ہزار ہے جس میں فرانسیسی افسروں کی تعداد ۲۲ ہزار سے کم نہیں۔ گویا ہر دو آدمی پر ایک فرانسیسی متعین ہے!!!

فوجی بجٹ کی تعداد ۶ کروڑ فرانک سالانہ ہے (۷ فرانک = عہ)

ایران کا فوجی بجٹ ۔ ۲۰ لاکھ انگریزی گنی ہے ۔ نفری ۴۴ ہزار

ترکی کا فوجی بجٹ ۔ ۵ کروڑ ترکی پونڈ ہے ۔ نفری ۱½ لاکھ (۱ ترکی پونڈ ۔ ایک انگریزی گنی)

اطالیہ کا بجٹ ۔ ۵ کروڑ انگریزی گنی ہے ۔ نفری ۴ لاکھ ۷۰ ہزار

امور خارجیہ | سلطان وقت کسی بیرونی طاقت سے معاہدہ درکنار خط و کتابت بھی نہیں کر سکتا ۔ نہ کسی بڑے عہدہ دار کو ملازم یا موقوف کر سکتا ہے ۔ ہر معاملہ میں فرانسیسی حاکم اعلیٰ کا دست نگر ہے ۔ سلطان کی حالت مثل اس تعلقدار کے ہے جس کا علاقہ کورٹ ہو گیا ہو یا اس رئیس کی مانند ہے جس کے اختیارات سلب کر لئے گئے ہوں ۔

مغربی اخلاق | میں اگرچہ مغرب اقصیٰ کے بہترین و گراں ترین ہوٹل میں قیام کرتا تھا لیکن فی الحقیقت کمرہ صرف رات کے بسیرے اور صبح کے ناشتہ کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا کیونکہ نو بجے صبح سے کوچہ گردی کو جو نکلتا تو ۹-۱۰ بجے شب سے قبل نشیمن دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا ۔ ہوٹل پہنچکر گرم پانی سے غسل کرنا میرا اولین کام ہوتا تھا ۔ اس کے بعد دن بھر کی یادداشتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ جدا گانہ اوراق پر ٹانکتا اور پھر مطالعہ کتب و نقشہ جات سے صبح کا پروگرام مرتب کر کے گیارہ بارہ بجے تک گرم گدگدی بچھونہ میں فرانسیسی کمبلوں کے غلاف میں گھسکر زمانہ ماضی و مستقبل کے خواب دیکھنے لگتا ۔ زمانہ سیاحت میں بجز چار خاندانوں کے کہ جن کے افراد سے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا دیگر اہل مغرب کے اخلاق و تواضع کے امتحان کا موقعہ نہیں ملا اور میرے لئے یہ ممکن بھی نہ تھا کیونکہ اس قلیل زمانہ میں ایک ہی کام ہو سکتا تھا ۔ یا تو اہل مغرب سے خوش گپیاں کرتا یا بازار ۔ مقابر و مساجد کی زیارت ۔ وقت کم تھا ۔ سر میں سیر و تماشہ کا سودا اور پیر میں کوہ نوردی کا چکر ۔ بہرحال دل کے حوصلہ خوب چل پھر کر نکال لئے اور

مشہور مقامات میں سے شاید ہی کوئی زیارت سے بچ رہا ہو۔اہل مغرب سے ملنے جلنے کے موقعہ بھی ملے مگر کس طرح؟ مساجد ومقابر۔ بازار وہاٹ۔ ڈاکخانہ وریل۔ مدرسہ وخانقاہ میں۔ کبھی ان سے علیک سلیک اور مصافحہ اور کبھی دوچار باتیں کرنے کا موقعہ بھی مل جاتا لیکن یہ سب کچھ سرسری ہوتا تھا میرے خیال میں ہر اہل مشرق بالخصوص ہر مسلمان متواضع وملنسار واقع ہوا ہے۔بعض قہوہ خانوں میں مغربی تواضع نے بلا کسی تعارف کے مجھ سے ایک دوبات چیت کرنے کے بعد قہوہ بھی پیش کیا کسی زاویہ سے تسبیح اور کہیں سے مہندی کی پوڑیہ یا گلاب کی پنکھڑیاں بطور سوغات وتبرک ملیں فاس۔ رباط۔ تیطوان۔مراکش کے اکابر نے پہلی ہی ملاقات میں کسی نہ کسی تحفہ تصویر رومال۔ میوہ۔ کتاب سے سرفراز بھی فرمایا۔طنجہ کے ایک مسلمان کتب فروش نے دھوکہ دے کر ایک کتاب کی دوچند قیمت بھی وصول کرلی اور ایک رئیس اعظم نے اس ظن فاسد پر کہ راقم الحروف بطور ایک محتاج مسافر کے امداد زادراہ کے لئے آیا ہوگا ملنے سے احتراز بھی کیا۔ یہی کیفیت مراکش کے ایک امیر کبیر کے یہاں پیش آئی یعنی پہنچنے کے دوسرے ہی دن میں ایک دلّیل کے ہمراہ پیادہ پا جارہا تھا کہ ایک محل کے پاس پہنچکر اُس نے کہا کہ جس امیر کا مکان پوچھتا تھا وہ یہی ہے۔اتفاق سے تعارفی خط پاس نہ تھا۔ لیکن دلّیل کی باتوں میں آگیا جس نے اندر جاکر خدا جانے کیا کہا اور کیا سنا کہ ذرا دیر بعد سر پنچا کر کے کہنے لگا کہ سیدی کو فرصت نہیں ہے۔اتفاق سے ایک روز بعد قونصل خانہ میں اہل علم سے ملنے کے لئے تعارف چاہا اور انگریزی امداد کا کہاں تک شکریہ ادا کروں کہ ذریعہ ٹیلیفون دو اصحاب نے انتظام بھی کردیا چنانچہ دوسرے دن جب موٹر میں روانہ ہوا تو چند منٹ کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ جس دہلیز سی پرسوں

مردود ہو چکا تھا وہیں موٹر ٹھیری۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ شوفر سے پوچھا کہ یہ کونسا مکان ہے اس نے کہا کہ جس کا پتہ قونصل خانہ سے بتلایا گیا تھا۔ یہ گفتگو ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ امیر کبیر کے کاتب یا حاجب سیارہ کے پاس پہنچے اور فوراً دروازہ کھول کر قدم بڑھانے کے لئے استدعا کی۔ میں اترا۔ اور پہرہ والہ کی سلامی لیتا ہوا باغیچہ میں داخل ہوا جہاں امیر صاحب کے فرزند ارجمند انجمن استقبال کے لئے حاضر تھے اور آگے بڑھا تو دیوان خانہ میں تالب فرش خود حضرت سیدی جلاوی صاحب کو انتظار کرتے ہوئے پایا جنھوں نے اس گرم جوشی اور تپاک سے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گو باہم بڑے پرانے بچھڑے ہوئے دوست تھے تقریباً ایک گھنٹہ کی گپ شپ قہوہ نوشی میوہ خوری عطر پاشی۔ زنگار بینی کے بعد رخصت ہوا لیکن درحقیقت یہ میری آؤ بھگت نہ تھی بلکہ دولت انگلشیہ کا ایک ادنیٰ معجزہ تھا کہ ایک غیر ملک میں جہاں جہاں فرانس کا تسلط ہے ایک انگریز افسر کا سکہ کس قدر رواں ہے۔ تواضع سے مطلب بھی یہ تھا کہ قونصل خانہ کے روزنامچہ میں ان کا نام عزت و احترام سے درج کیا جائے۔

• اہل مغرب من حیث القوم متواضع اور خلیق ہیں لیکن بہت مفلس و مفلوک الحال اور مالی امداد میں ہندوستان سے بہت پیچھے۔ چنانچہ جس قدر غیر ملکی مسلمان ہندوستان میں آتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی مغرب اقصیٰ میں نہیں جاتا۔

مغربی کھانا جس طرح شمالی ہند میں چپاتی اور بنگال و آسام میں چاول کھانیکا جزو لاینفک بن گیا ہے اسی طرح مغرب اقصیٰ میں کُس کُس کا ہونا لازمی ہے۔ امیر غریب۔ بچے بوڑھے کُس کُس ضرور کھائیں گے۔ غربا ابال کر خشک کھائیں گے۔ امرا مرغ و ماہی کے ساتھ کُس کُس جوار اور گیہوں کا دلیہ ہے جو تھولی کی طرح پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ مغرب اقصیٰ کے کھانے مشرقی کھانوں سے ملتے جلتے ہیں۔

ایک شاندار دعوت کا حال سنئے۔ ایک پر تکلف محل کے ایک شہ نشین میں جس پر اندلس مرحوم کی تعمیر کا دھوکہ ہوتا تھا شریف وزان نے میری دعوت کی جس میں میرے علاوہ سات اور اشخاص بھی تھے۔ پہلے ہندوستانی طریقہ سے ہاتھ دھلائے گئے جس کی بعد چار چار اشخاص ایک ایک تھال کے گرد گدے تکیوں پر بٹھائے گئے۔ کھانے کا دور شروع ہو۔ ایک بڑی قاب میں دو مرغ بریاں آئے۔ چونکہ روٹی نہ تھی اور نہ چھری کانٹہ اس لئے میں سٹ پٹا گیا۔ میزبان نے مجھ سے بسم اللہ کرانا چاہی لیکن میں حیران تھا کہ کس طرح کھاؤں۔ آخر میرے انکسار و اصرار پر یا میری عدم واقفیت کو تاڑ کر انھوں نے ابتدا کی اور بے تکلف انگلیوں سے سینہ کا گوشت نوچ کر میرے سامنے رکھ دیا جسے شکریہ کے ساتھ کھایا۔ سب کی انگلیاں نشتر زنی میں مصروف تھیں میں نے دو چار لقموں کے بعد ہاتھ روک لیا۔ اس پر ایک خوش رو خوش پوش خوش سلیقہ غلام نے قاب اٹھالی۔ اب مچھلی کی باری آئی جو تلی ہوئی تھی۔ مچھلی کے بعد کُس کُس کا نمبر تھا جو مدراسی پلاؤ کی طرح میوہ۔ گوشت۔ ترکاری کا معجون مرکب بنا ہوا تھا۔ یعنی تھولی کے ڈھیر پر گوشت بریاں کے بوچھ۔ آلو۔ ناریل۔ سیب۔ بادام کشمش کے ڈھیر لگے تھے۔ میں دو تین لقمہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد چاول آئے لیکن طباق دیکھتے ہی اشتہا غائب ہوگئی۔ پاؤ بھر چاولوں میں شاید ایک سیر چکنائی ڈالدی تھی بو باس شکل وصورت میں ہندوستانی پلاؤ سے بہت گرا ہوا تھا۔ پلاؤ کے بعد خمیری روٹیاں جیسی عرب میں ملتی ہیں آئیں اور چار پیالوں میں صرف شوربا۔ روٹی لذیذ تھی لیکن شوربا سیٹھا کیونکہ سُرخ مرچ سے محروم تھا۔ اب کھانا ختم ہوگیا۔ دل نے کہا کہ میٹھی چیز سے محروم ہی رہے۔ خیر ہاتھ دھو کر دعا پڑھ کر بیٹھے ہی تھے کہ قہوہ کا

پُر تکلف نقرئی سماوار مع متعدد خوانوں کے دکھائی دیا۔ سرپوش کھولے گئے تو سموسہ گزک جلیبی۔ راحت الحلقوم۔ شکر پارہ۔ حلوے کے خوان نظر آئے۔ ایک پیالی تلخ مغربی قہوہ کی پی ہی تھی کہ چند کشتیاں سبز وخشک میوہ کی آئیں۔ سردہ بہت اچھا تھا انگور اور سیب کا کیا کہنا لیکن نارنگی اچھی نہ تھی۔ ناگ پھنی کا پھل بھی تھا جس کو اہل مغرب بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد مغربی مرض متعدی کا دور چلا یعنی سگرٹ گشت کرائے گئے۔ میں نے دریافت کیا کہ حقہ کیوں نہیں پیا جاتا معلوم ہوا کہ یورپ کے قرب اور فرانسیسی اختلاط سے راندہ درگاہ ہوگیا ہے۔

یہ کیفیت تو طنجہ کی دعوت کی تھی مختلف مقامات میں اسی قسم کی اور دعوتیں ہوئیں کہیں کھانوں کا دور کم تھا اور کہیں زیادہ۔ بازار میں شامی کباب۔ سیخ کے کباب۔ بھنی ہوئی کلیجی۔ فیرنی وغیرہ کھانے کا اتفاق ہوا جو اچھی خاصی تھیں۔

لباس اہل مغرب کا لباس عربی لباس سے ملتا جلتا ہے۔ ترکی نے کہ جو یورپ کا عرصہ سے حلقہ بگوش بنا ہوا تھا ریاست جمہوریہ میں منقلب ہوتے ہی لندن وپیرس کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے۔ مصر ہمیشہ سے فرعون بے سامان رہا۔ ایران نے بھی کوٹ وہیٹ کی رضاجوئی اختیار کرلی ہے لیکن سیدہ زہرا کا گلزار جس کو ایک صحابی نے خس وخاشاک سے صاف کیا تھا اور جس کی اولین آبیاری سردار جنت کے لخت جگر نے آج سی بارہ سو برس قبل اس نیک نیتی سے کی تھی کہ اس کا خاندان یورپی آرایش سے مبرّا و منزّا ہے۔ اقصائی مغرب کا شمشیر زن کوٹ پتلون سے بے نیاز ہے۔ اس کا سفید دہقانی عمامہ کہ جس کی بندش راجپوتی بانکپن اور جاوری رعنائی سے کوسوں دور رہی ہیٹ کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا۔ اور نہ اس کا گھٹیلا جوتہ بوٹ اور شو کی روبرو پابوس منت

ہوا۔ وہ اپنی کفتان سلہم اور بلاغی کو پیرس کی شارع اپیرا ہیں رہن نہیں رکھتا اور نہ اس کی صبیحہ عذرا کہ جس کی خال ہندی کو بلبل شیراز اگر دیکھ لیتا تو کوہ قاف کے ترکوں کا خواب کبھی نہ دیکھتا۔ شارع امن کی کسی مشاطہ کی مرہون منت ہوئی جبل ریف کے غنچۂ ناشگفتہ کی برق تبسم کسی نامحرم پر نہیں گری۔ وہ ابھی تک کلبہ احزان کی ٹمٹماتی ہوئی تیی ہے شمع انجمن بننے کا اعزاز النقرہ کی پرکالہ آتش کو مبارک ہو پردہ سختی کے ساتھ جاری ہے۔ شریف عورت بازار میں نہیں نکلتی۔ خادمہ بھی سودا سلف کو جب جاتی ہے تو حایق اور یشم میں ملفوف ہوجاتی ہے ورنہ ردا تو ضرور ہی اوڑھ لیتی ہے مردانہ لباس دوہرے جلاب کفتان اور سلہم پر مشتمل ہے شلوار ہندوستانی شرعی پاجامہ کی طرح ڈھیلا گو کسی قدر اونچا ہوتا ہے۔ عمامہ جو بالعموم سفید ہوتا ہے میواتی پگڑی کی طرح لپیٹ لیا جاتا ہے۔ علماء قوم بواہیر کی عاملی عمامہ کی طرح مدور عمامہ باندھتے ہیں سلہم ایک ڈھیلا چغہ ہے جس کا سرا ایک کنٹوب (کوب) سے مزین ہوتا ہے۔ لڑکے شادی سے پہلے عمامہ نہیں باندھتے۔ سرپوشی کے لئے سرخ فاسی شاشیہ (ترکی ٹوپی) کافی ہے۔ لیکن مساجد۔ زاویہ اور بزرگان دین کی خدمت میں جاتے وقت شاشیہ پر سلہم کا کوب ڈال لیتے ہیں۔ جوتہ گھیتلہ نما جیسا شاہان مغلیہ پہنتے تھے رائج ہے تیطوان کا "بلاغی" جوتہ اور فاس کا "سراکسی" جوتہ بہت مشہور ہے۔ مرد زرد رنگ کا جوتہ پہنتا ہے۔ سبز و سرخ رنگ صرف عورت کے لئے مخصوص ہیں۔ عورت سفید چوڑیدار پائجامہ پہنتی ہے۔ یورپی ہیٹ۔ فیلٹ۔ بولر وغیرہ کا استعمال کفر ہے۔ البتہ دیسی کھجور کی مدور چھجہ دار ٹوپی کا جیسے آسام و برما کے کاشتکار پہنتے ہیں علاقہ ماورا جبل اطلس میں ازمنہ قدیم سے رائج ہے۔ بلکہ ان کا بیان تو یہ ہے کہ چٹائی دار چھجہ نما ٹوپی یورپی

ہیٹ کی جدہ مکرمہ ہے۔ فاس شاشیہ کا گھر تھا اور ترکوں نے عمامہ کے خلاف جب جہاد کیا تو شہر فاس کے سرخ شاشیہ کو اپنی قلمرو میں جاری کیا اور اسی دارالسلطنت کی مناسبت سے اہل یورپ اور ان کی اتباع میں اہل ہند غلطی سے اسکو "فیض" کہتے ہیں کیونکہ شہر فاس کو اہل یورپ "فیض" کہتے ہیں لیکن اب فاسی کارگاہ آسٹریا و اطالیہ کے کارخانوں کی آگے سرد پڑ گئی۔ افلاس نے اجنبی مال کو بوجہ ارزانی ملکی صنعت پر ترجیح دے رکھی ہے۔

یہود کا لباس مغرب اقصیٰ میں سیاہ عمامہ۔ سیاہ کلاہ۔ سیاہ جوتہ ہے۔

ہوٹل متجسس احباب کے لئے غالباً یہ لکھنا غیر مفید نہ ہوگا کہ ملک مغرب اقصیٰ میں ہوٹلوں کی وہ کثرت ہے کہ الامان الحفیظ۔ نظیر کے طور پر شہر دارالبیضا کو لیجیے کہ جس کی آبادی شہر بریلی سے بھی کم ہے۔ لیکن ہوٹلوں کی تعداد (۳۳) ہے رستوران اس کے علاوہ رہے۔ فاس کہ جس کی آبادی لکھنؤ سے ایک تہائی ہے (۴۰) ہوٹلوں کو چلا رہا ہے۔ جملہ ہوٹل اپنے نرخ کی مناسبت سے صاف ستھرے اور آراستہ ہیں۔ بڑھیا ہوٹل لندن و پیرس کے اعلیٰ ترین ہوٹل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ متوسط درجہ کی ہوٹل بھی ہندوستان کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں سے بدرجہا زیادہ صاف آرامدہ اور ارزاں ہیں ہوٹلوں کی کثرت سیاحان کی کثرت پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے سیاح شمال افریقہ کو جوق جوق جاتے ہیں۔ مجھ سے کئی جگہ امریکانی و جرمن سیاحان سے گفتگو ہوئی۔ جنھوں نے بیان کیا کہ ہم ہندوستان جاکر کیا کریں۔ بمبئی و کلکتہ شملہ و منصوری بالکل یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں بازاروں میں جاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر انگریز ہو گیا ہے۔ اہل ہند نہ ہم سے زیادہ حسین ہیں اور نہ ہم سے زیادہ عمدہ انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ ہم مشرق کو مشرقی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ فاس

مکناسہ۔ رباط۔ مراکش وغیرہ ابھی تک اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں۔ انگریزی لباس دیکھتے دیکھتے جب ہم تھک جاتے ہیں تو نئی چیز نیا ملک نیا لباس دیکھنے کے لئے ایک ماہ کی رخصت لے کر ادھر آجاتے ہیں۔ امریکہ سے مغرب اقصیٰ کا راستہ سات آٹھ روز کا ہے لیکن ہندوستان پہنچنے کے لئے ایک ماہ درکار ہوتا ہے۔ یہی کیفیت جرمنی۔ روس اطالیہ کی ہے کہ وہاں کے سیاح دو تین روز کے اندر اندر مغرب اقصیٰ پہنچ جاتے ہیں درآنحالیکہ ہندوستان پہنچنے کے لئے پندرہ روز مطلوب ہوتے ہیں۔

اسی کثرت سیاحان کی وجہ سے مشرقی اشیار کی تجارت خوب ہوتی ہے ہندی مسلمانوں کو یہاں آنے کی کب توفیق ہوئی۔ ہاں حیدرآباد سندھ کے ہندو تجار مغرب اقصیٰ کے ہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رباط۔ مکناسہ۔ فاس میں تو ان کی کوٹھیاں ۶۰۔۶۰ برس سے قائم ہیں۔ الجزائر افریقہ صقلیہ وغیرہ میں بھی ان کا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ ان کی دوکانوں پر ہندوستان کی بھی تھوڑی بہت چیزیں دیکھنے میں آئیں لیکن ان کا بیان ہے کہ ہندی سامان کے مقابلہ میں مصر و دمشق کے برتن۔ کپڑے۔ زیور۔ جاپان کے کھلونے۔ ایران کے قالین وغیرہ بہت ارزاں پڑتے ہیں۔

مغرب اقصیٰ میں جس بڑی دوکان کو دیکھیں گے وہ فرانسیسی کی نکلے گی یا یہودی کی۔ عرب و بربر معمولی خوردہ فروشی پر قناعت کئے ہوئے ہے۔

حسب ذیل ہندی اشیار کی نکاسی شمال افریقہ میں اچھی طرح ہوسکتی ہے۔

نقرئی سامان۔ کٹک اور کشمیر کا۔ چوبی سامان۔ کشمیر۔ نگینہ کا عمدہ۔ جے پور اور ٹونک کے عمدہ نما قالین۔

ظروف۔ مراد آباد کے قلعی شدہ ظروف۔